نرگس

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱۔ اُجرت ہر حال پیشگی لی جائیگی۔ ووچر یا وی۔ پی کے ذریعہ روانہ کرنا منظور نہیں ہے۔

۲۔ جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں مزخ وہی ماہانہ رہے گا۔

۳۔ اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر..... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر..... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند..... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند..... ۶ شلنگ

نوٹ:۔ رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔ "مینجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب

یہ جلد اول ہے جسمیں ۲۲ء سے لیکر ۲۵ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ باقی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل رہی ہے کسی سے مخفی نہیں۔ اس مجموعہ میں علمی ادبی تاریخی تنقیدی مسائل ہیں۔

قیمت علاوہ محصول (۲ سے ۳)

مکتوبات نیاز

اپنے پیر نگار کے نام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگار ہی وہ مباحث ہیں جو رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل اصلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے متعلقات ادبی دوستوں کا مجموعہ۔ جس میں ۳۲ افسانے ۲۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ پیرفسانہ اور ہر تعالا اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (دیا) شہوانیات

اس کتاب میں مخالشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ بحث کیا گیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔

قیمت تین روپیہ (سے ۳)

علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ار تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ ر) ششماہی تین روپیہ (ے ر)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۲۹)	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۳۶ء	شمار (۳)

ملاحظات		۲
س ش ص	وصی احمد بلگرامی بی۔ اے	۹
مشرق بعید کے زرد خطرہ کی داستان	عبدالرحیم شبلی	۴۲
اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام		۴۸
علم نجوم اور انسانی مستقبل		۶۰
چوری	الیاس اسلام پوری	۶۱
مکتوبات نیاز		۷۴
اعتبارات		۷۷
باب الاستفسار		۷۸

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

جلد (۲۹)	مارچ سنہ ۳۶ء	شمار (۳)

ملاحظات

خلافت وامامت

اس مسئلہ پر پچھلے مہینے کے نگار میں جو محاکمہ میرا شایع ہوا ہے اسے خلاف توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متقشف حضرات ہنوز مطمئن نہ ہوں گے اور نہ شاید کبھی ہو سکتے ہیں

میں نے جن نتائج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض جو حضرات شیعہ کیلئے قابل قبول ہیں اہلِ تسنن کے نزدیک غلط ہیں اور جو سنیوں کے موافق ہیں وہ شیعوں کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے اسلئے ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسایل کو بھی لے لیا جائے جو میرے مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آسکتے ہیں مثلاً:-

۱— عصمت وعفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ وخطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا

اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں ؟

۲ — انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلایل کیا ہو سکتے ہیں ؟

۳ — کیا انبیاء، و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے، اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

۴ — قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قایم رہنا کیوں ضروری ہے ؟

۵ — وصایت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں ؟

۶ — امامت کا بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

۷ — جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے، اس کو غلط قرار دینے کے لئے اثنا عشری جماعت کیا دلایل اپنے پاس رکھتی ہے

۸ — امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہہ

۹ — ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں - اگر پڑا تو کیا ؟

۱۰ — مسئلۂ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۱۱ — اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لئے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں -

چنانچہ میں ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسایل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور جہاں تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال نہ کریں جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور درایتاً قابل قبول نہیں ہیں

میں اس بحث کے لئے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو مہینے کی مہلت دے سکتا ہوں، اسکے بعد مجھے حق حاصل ہوگا کہ تمام شایع شدہ مضامین کے مباحث و دلایل کو سامنے رکھ کر خود اپنی رائے پیش کروں اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ جنوری کا پرچہ صرف اسی موضوع کے لئے وقف ہو (اگر ناظرین نگار نے اس کو پسند کیا) میں اس دوران میں ایک استفتاء بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کروں گا اور جو جوابات مجھے موصول ہونگے ان سے میں اپنے محاکمہ کے وقت کام لوں گا —

حبشہ و اطالیہ

اس وقت تک جتنی خبریں محاذ جنگ سے آرہی ہیں وہ خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، لیکن خلاف توقع ان میں سے ایک بھی نہیں ہے — حبشہ و اطالیہ کا مقابلہ ہی کیا - ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی کیسی، لیکن اس جنگ

کے بیک گرونڈ میں جو نقوش یورپین سیاست کے ظاہر ہو رہے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔

جمعیتہ الاقوام کے ممبر اطالیہ و حبشہ دونوں ہیں، لیکن اسے رنگ و نسل کا معجزہ کہئے یا قوی کا ضعیف کو کھا جانے کا قدرتی قانون کہ اطالیہ برابر غاصبانہ سرزمین حبش میں گھستا چلا جا رہا ہے اور جمعیتہ الامم اسوقت تک یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ اطالیہ کی راہ میں کونسی اقتصادی دشواریاں حایل کی جائیں گی اور کب۔ جلسے پر جلسے طلب ہو رہے ہیں، کمیٹیوں پر کمیٹیاں بن رہی ہیں، لیکن نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتے ہیں اور اگر کوئی ارادہ ہے تو وہ کونسی مبارک تاریخ ہوگی جب اس کو پورا کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے [redacted] بہت اہم ہے، جب تک دنیا کی تمام اقوام سے استصواب نہ کر لیا جائے کیونکر کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حکومتوں کے نمایندوں سے تبادلۂ خیال کے لئے کافی وقت چاہئے۔ چونکہ یہ معاملہ ایک سیاہ فام، غریب و ناچار حبشہ کا ہے اس لئے تار، ٹیلی فون، ریڈیو، ہوائی جہاز اور تمام وہ ذرائع جو فوری مخابرت و مراسلت کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں بیکار ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن اگر زیادتی حبش یا کسی اور غیر یورپین قوم کی ہوتی تو کبھی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہوتا کہ:۔

"فسلوہ والی الجحیم صلوہ" پکڑو حرامزادہ کو اور ڈالدو کھینچکر جہنم میں — اس سے قبل ہم اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ جمعیتہ الامم کی ہمدردیاں حبشہ کے ساتھ کوئی معنی نہیں رکھتیں اور اندرونی طور پر حبشہ کا حصہ بانٹ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ سر سموئیل ہور کی تقریر سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ فرانس و اطالیہ کے درمیان پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا، رہگیا برطانیہ سو ظاہر ہے کہ جب تک فرانس اس کا ہمنوا نہ ہو وہ تنہا کیا کر سکتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں جنگ زرگری اور یہی ہیں وہ شاطرانہ چالیں، جن پر ایک حبشہ کیا خدا جانے کتنی قوموں کی آزادیاں اس سے قبل قربان ہو چکی ہیں — اطالیہ کا قبضہ، حبشہ کے وسیع علاقہ پر حقایق مسلمہ میں سے ہے اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد جب حصوں کی تقسیم کا سوال آئے گا تو وہ قومیں بھی محروم نہ رہیں گی جو آج اطالیہ کے اس غاصبانہ اقدام کے خلاف شدید ترین صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہیں۔ سچ ہے دنیا میں ضعیف و کمزور ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ خدائے کلیسہ بھی اسے معاف نہیں کر سکتا، بندگان کلیسہ کا کیا ذکر ہے۔

شہید گنج کی مسجد

اس دوران میں سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے پنجاب اور علی الخصوص لاہور کی فضا کو حد سے زیادہ مکدر کر رکھا ہے شہید گنج کی مسجد کا واقعہ ہے جس کی تفصیل اخباروں کے ذریعہ سے سب کو معلوم ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ مسجد ہو یا مندر محض عمارت ہونے کے لحاظ سے ان میں سے کسی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، لیکن تمدن و معاشرت کے باہمی تعلقات میں صرف مادی چیزوں کی قیمت ہی کا سوال پیدا نہیں ہوتا

بلکہ اُن جذبات وکیفیات کا بھی ہوا کرتا ہے جو انفرادی طور سے رونما ہوتے رہتے ہیں چہ جائیکہ وہ جنھوں نے اجتماعی حیثیت اختیار کرلی ہو۔ اس لئے ایسے معاملات میں قبضہ وملکیت کا رکیک وغیر روادارانہ سوال اُٹھاکر کسی قوم یا جماعت کے جذبات کو صدمہ پہونچانا کبھی قرین عقل نہیں ہوسکتا۔ مانا کہ شہید گنج کی مسجد غیر آباد تھی ویران ومسمار تھی، گوردوارہ کے احاطہ میں تھی، سکھوں کے قبضہ میں تھی، لیکن تھی بہرحال وہ ایک ایسی چیز جسے مسجد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور اس لئے سکھ جماعت بھی بخوبی واقف تھی کہ مذہبی حیثیت سے تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ واجب الاحترام ہے اور اس کے ڈھادینے سے قدرتاً ان کو صدمہ پہونچنا چاہئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سکھوں نے باوصف اس علم کے کیوں اس کی مسماری پر اصرار کیا اور اس سے کیا فائدہ انھیں حاصل ہوا۔ مجھے نہیں معلوم اور نہ اس سے بحث کرنے کی ضرورت کہ حکومت کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا تھا اور وہ سکھوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی کس حد تک ذمہ دار ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ جس حد تک دو مختلف قوموں کے رابطۂ باہمی کا تعلق ہے، سکھوں کی یہ حرکت قطعاً غیر دانشمندانہ تھی۔ اور ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ کسی ایسے مسئلہ میں جس کا تعلق کسی جماعت کے قومی وقار سے ہو کوئی قدم بغیر سوچے سمجھے ہوئے اُٹھانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ وقتی طور پر سکھوں نے اس کو محسوس کرکے کوئی مسرت حاصل کی ہو کہ انھوں نے مسلمانوں کو مذہبی شکست دیدی، لیکن اتنے بچے تو شاید وہ بھی نہیں ہیں کہ اس ایک مسجد کے ڈھادینے کو وہ مسلمانوں یا اسلام کی ہزیمت سے تعبیر کریں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوائے ایک جاہلانہ جوش کے اس کو اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اگر سکھ جماعت قانون یا حکومت کی امداد حاصل کئے بغیر اس مسجد کو ڈھادینے میں کامیاب ہوجاتی تو خیر ایک معنی کرکے یہ ان کی جرأت وبہادری کا کارنامہ ہوسکتا تھا، لیکن انھوں نے حکومت کی امداد حاصل کرکے اس فخر کو بھی اپنے ہاتھ سے کھودیا اور مسلمانوں کے قومی وقار کو صدمہ پہونچانے کے غیر دانشمندانہ جوش میں انھوں نے سب سے پہلے اپنے قومی وقار کو تباہ وبرباد کردیا۔

مسلمانوں نے اس مسئلہ میں جس جوش کا اظہار کیا وہ بالکل قدرتی امر تھا اور اگر وہ چند دن کے بعد فرو ہوجائے تو یہ بھی خلاف توقع نہ ہوگا، کیونکہ جب کسی محکوم ملک کی دو محکوم قوموں میں باہمی گرآویزش ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے کیونکہ بہرحال امن کا ذمہ دار کوئی اور ہے اور وہ اپنی قوت سے ان سب کو بآسانی خاموش کرسکتا ہے۔ اس لئے میں ایک حد تک مسلمانوں کے موجودہ طرز عمل کا بھی حامی نہیں ہوں اور ایسی شورشوں کو جو آخرکار خود ملکی مصالح کو تباہ کرنے والی ثابت ہوں، میں کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات خواہ کیسے ہی ناخوشگوار ہوگئے ہوں، لیکن ان دونوں

کو اپنی اپنی جگہ سمجھنا چاہیئے کہ انھیں رہنا اسی سرزمین میں ہے، جو سکھ ہے وہ سکھ ہی رہے گا اور جو مسلمان ہے وہ مسلمان۔ اس لئے آپس کی مخالفت سوائے اس کے کہ دونوں کے لئے مضرت رساں ہو کوئی اور نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

اگر سکھ جماعت نے ایک بلند و شریفانہ جذبہ سے کام لیکر مسجد واپس کرنے کا اقدام نہ کیا، تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ کم از کم وہ تو اپنی شرافت و رواداری کو ہاتھ سے نہ [redacted] ور قتل و خون کی کوئی ایسی مثال اپنی طرف سے قائم نہ کریں جو کسی ذلیل جذبۂ انتقام کو ظاہر کرنے والی ہو۔

اب معلوم ہوا ہے کہ مسٹر جناح نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے قانون کی مخالفت بند کر دی گئی ہے۔ یعنی اب ان کے جتھے مسجد میں اذان دینے اور نماز پڑھنے کے ارادہ سے چلکر اپنے آپ کو گرفتار نہیں کراتے۔ ہر چند اسوقت تک کوئی علامت باہمی مفاہمت کی ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ اس باب میں جب تک سکھ جماعت بھی رواداری کے لئے طیار نہ ہو فیصلہ دشوار ہے، تاہم اس وقفہ سے اتنا فایدہ ضرور ہوگا کہ جو صورت مقابلہ کی مسلمانوں نے اختیار کر رکھی تھی، ممکن ہے وہ پھر پیدا نہ ہو اور ان کو یہ سمجھنے کا موقعہ مل جائے کہ

کفِ خونے کہ دارم تا چکیدن خاک می گردد
چساں گیرم بہ ایں بے مایگی دامانِ قاتل را

جاپان و چین

سیاسیات کے جہاں اور بہت سے رمز ہیں انھیں میں ایک وقت کی نباضی بھی ہے۔ یعنی یہ دیکھنا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے یا نہیں اور جب گرم ہو جائے تو پھر ضرب لگانے میں پس و پیش نہ کرنا۔ دول یوروپ تو خیر اس میں کافی مشاق ہیں، لیکن مشرق میں جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اس کو سمجھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔

مشرق پر مغربی تسلط کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک داستان ہے صرف کمزوری سے فایدہ اٹھانے کی جس کا اصطلاحی نام تہذیب و تمدن کی اشاعت ہے۔ ہندوستان پر برطانیہ نے صرف اسی لئے قبضہ کیا کہ یہاں کے حیوانوں کو انسان بنائے، اٹلی حبش پر قابض ہونا چاہتا ہے وہ محض اس لئے کہ وہاں تہذیب کی اشاعت کرے یوروپ کی حکومتوں نے ترکی کو صرف اسی نیت سے پامال کر دینا چاہا کہ وہ ناتراشیدہ تھی، الغرض کوئی فتوحانہ اقدام مغرب کا ایسا نہیں جس میں بنی نوع انسان کی ترقی کا جذبہ کام نہ کرتا ہو، اب یہ اور بات ہے کہ بدقسمتی سے کوئی مفتوح قوم بدستور مفلوک الحال اور پریشان روزگار بنی رہے ـــــ لیکن جاپان اس باب میں غالباً اہلِ مغر

سے بھی بازی لے گیا ہے، کیونکہ ایک طرف وہ اپنے ہمسایہ ملک چین کی کمزوری سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور دوسری طرف دول مغرب کی باہمی رقابتوں سے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جب کبھی یہ صورت پیش آئی اس نے اسی وقت کسی نکسی بہانہ سے چین کو دبایا اور فایدہ حاصل کرلیا۔ گزشتہ سال اس نے لیگ اقوام کی کمزوری سے پورا فایدہ اُٹھایا اور اب کہ اطالیہ و حبش کی جنگ نے دول یوروپ کے سامنے ایک عالمگیر جنگ کے امکانات پیش کر رکھے ہیں وہ پھر شمالی چین کو اپنے عسکری نظام سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ جاپان کا مطالبہ یہ ہے کہ چین کے شمالی صوبوں کی حکومت نانکن کے اثر سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے اور اس خواہش کی تہ میں تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ وہ اس تحریک اشتراکیت (کمیونزم) سے خایف ہے جس نے اسوقت چین کے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے، کیونکہ اگر یہی تحریک جاپان میں پھیل گئی تو اس کی موجودہ عسکریت و ملوکیت خاک میں مل جائے گی، دوسرا سبب یہ ہے کہ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور خام پیداوار حاصل کرنے کے لئے دوسری زمینوں کی ضرورت ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے شمالی چین سے زیادہ موزوں کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہاں لاکھوں ایکڑ زمین غیر مزروعہ پڑی ہوئی ہے اور معدنیات بھی بہت کافی پائی جاتی ہیں تیسرا سبب یہ کہ وہ سوویٹ حکومت، اور جاپان کے درمیان ایک زبردست مانع حایل کرنا چاہتا ہے اور وہ یہی علاقہ ہوسکتا ہے۔ سب سے پہلے ستمبر ۳۴ء میں جنرل ٹاڈا (ٹین ٹسین کے کمانڈر) نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چین کے پانچ شمالی صوبوں کو حکومت نین کنگ کے اثر سے آزاد ہونا چاہیئے اور حکومت منچوکو کو جاپان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ اس مطالبہ کو جاپان کی مجلس وزراء نے بھی تسلیم کرلیا اور اسی کے چار ماہ بعد وزیر خارجہ نے اس جدید پالیسی کا اعلان کردیا۔ یہاں تک تو خیر صرف زبانی باتیں تھیں، لیکن اسی کے ساتھ عملاً جو تدبیر جاپان نے اختیار کی وہ بھی سن لیجئے۔ ستمبر ۳۴ء کے اس زبانی مطالبہ کے بعد ہی اکتوبر میں ایک جاپانی مشن تنگھائی پہونچا اور قایدین افواج سے گفتگو کرنے کے بعد آرمی کانفرنس میں اعلان کردیا گیا کہ حکومت نین کنگ نے اگر اپنی معاندانہ پالیسی ترک نہ کی تو چین کے شمالی صوبوں سے چینی فوج نکالدی جائے گی اور اس علاقہ کو حکومت نین کنگ سے بالکل آزاد کردیا جائے گا۔ اس کے ساتھ چند چینی افسران بھی گرفتار کرلئے گئے اور دیوار چین کے جنوب میں جو غیر معسکر علاقہ ۲۵۰ میل کا جاپانی نگرانی میں ہے اس کے کمشنر نے بھی ایک تلغرافی سرکلر کے ذریعہ سے پانچ صوبوں کے گورنروں کو ہدایت کی کہ وہ خود مختاری کا اعلان کردیں —

جاپان کا خیال تھا کہ یہ تمام تدابیر کاربرآری کے لئے کافی ہوں گی، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور چین نے متحدہ آواز سے ان تمام مطالبات کو مسترد کردیا۔ اب جاپان نے دوسری تدبیر اختیار کی اور وہ یہ کہ بیک وقت تمام صوبوں کی خود مختاری چاہنے کے ایک ایک صوبہ کو علٰحدہ کرنا چاہا چنانچہ سب سے پہلے غیر معسکر علاقہ کے کمشنر نے اعلان آزادی کیا اسکے بعد علاقۂ سویان کو آزادی ملی اور اب دوسرے صوبوں کو بھی ملنے والی ہے۔ حکومت نین کنگ جو اسوقت حکومت چین سمجھی جاتی ہے وہ صرف ساحلی صوبوں پر قابض ہے اور اپنی کمزوری کے ساتھ لیگ اقوام کی بیچارگی سے بھی پوری طرح آگاہ ہے

اس لئے اب اگر کوئی چیز اسکے لئے امید افزا ہے تو صرف سوویٹ حکومت جو علاقۂ منچکوان میں کسی طرح جاپانی اقتدار کو دیکھنا پسند نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں عسکری طیاریاں نہایت تیزی کے ساتھ ہو رہی ہیں اور عجب نہیں کہ وہ جاپان سے اپنی گزشتہ شکست کا انتقام لینے کے لئے اس نزاع کو بہانہ قرار دے۔ بہرحال اسوقت مشرقِ اقصیٰ کی سیاسیات نہایت خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور عجب نہیں کہ پھر دنیا ایکبار اس آگ میں کود پڑنے کے لئے مجبور ہو، جو ۱۹۱۴ء میں مشتعل ہوئی تھی۔ حال ہی میں جرمنی کے پیغمبر قاید ہر ہٹلر نے جن الفاظ میں اپنی کھوئی ہوئی مستعمرات کا مطالبہ کیا ہے اور جن خفیہ فوجی طیاریوں میں وہ مصروف ہے، وہ بجائے خود اتنا زبردست خطرہ ہے کہ یوروپ کی سلطنت اس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی۔ دوسری طرف مسولینی نے حبشہ کے خلاف فوجکشی کر کے دولِ عظمیٰ کو عجیب و غریب پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے اور لیگ اقوام کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے والا ہے۔ تخفیف اسلحہ کی جو کانفرنسیں اس وقت تک منعقد ہوئی ہیں وہ بھی جنگ کے خطرہ کو دور نہ کر سکیں اور بحری قوت میں بھی اسوقت تک کوئی ایسا توازن پیدا نہیں ہو سکا کہ آیندہ امن کی توقعات اس پر قایم ہو سکیں۔ حال ہی میں جاپانی سپاہ کا اقدام بغاوت اور بعض بڑے بڑے عسکری قایدین و وزراء کا واقعۂ قتل، وہاں کی عام ذہنیت پر نہایت خوفناک روشنی ڈالتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عجب نہیں وہاں فیسسٹ نظام حکومت یا اشتراکیت کسی وقت پیدا ہو جائے کیونکہ جاپان کی روز افزوں آبادی اور اس کی اقتصادی خستہ حالی مجبور ہے کہ وہ لڑ کر فنا ہو جائے یا اپنی زندگی کے لئے اور نئی زمینیں حاصل کرے الغرض سیاسی مطلع نہایت مکدر ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کو ہر وقت جنگ کے آتشیں بادلوں کا منتظر رہنا چاہئے، خواہ وہ مشرقِ اقصیٰ کے افق سے بلند ہوں یا ساحل افریقہ سے۔

کانگرس کا آیندہ اجلاس

امسال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہونا قرار پایا ہے اور چونکہ جدید آئین حکومت کے رد و قبول کا فیصلہ اس اجلاس میں ہونے والا ہے اس لئے اسکی اہمیت ظاہر ہے اسوقت کانگرس کے اندر متعدد پارٹیاں نظر آتی ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ زبردست نیشنلسٹ جماعت ہے اور اسی کے مقابل سوشلسٹ، اور انھیں کے فتح و شکست پر کانگریس کا آیندہ لائحۂ عمل مرتب ہونے والا ہے۔ اول الذکر جماعت جدید آئین میں حصہ لینے کی طرفدار ہے اور موخر الذکر اس کو بالکل بے نتیجہ بات ظاہر کی ہے۔ گاندھی جی جس وقت تک کانگریس پر قابض رہے، اس کی پالیسی خواہ غلط ہو یا صحیح انھیں کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے ستیاگرہ و ترک موالات کا پروگرام پیش کیا تو سب نے اسی کو کعبۂ مقصود سمجھ لیا اور جب ملک کی خستگی کو دیکھ کر اس پروگرام کو انھوں نے منسوخ کر دیا تو سب پھر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے۔ اور چونکہ اس دوران میں انھوں نے عملاً کانگرس کے معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا، اس لئے طوائف الملوکی کی سی حیثیت پیدا ہو گئی اور منزل تک پہونچانے کے لئے اتنے دعویدار پیدا ہو گئے کہ لوگوں کو رہبر و رہزن میں تمیز دشوار ہو گئی، اب سنا ہے کہ وہ پھر اس اجلاس میں شریک ہوں گے اور ان کی شرکت کے معنی اب صرف یہ ہیں کہ وہ ہر نئی تحریک کو اہم ترین مقصد کی حیثیت سے کانگرس کے سامنے پیش کریں، لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور ہمیں امید نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکیں۔ کیونکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگرس کا رُخ یقیناً کسی نہ کسی ہنگامہ خیز مقصد کی طرف مایل ہونا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ سوشلسٹ جماعت کو اس مرتبہ کامیابی ہو جائے بہرحال اس اجلاس کی اہمیت ظاہر ہے اور جدید آئین حکومت کی بہت سی آسانیاں و دشواریاں اسی پر منحصر ہیں۔

س۔ش۔ص

(مسلسل)

باب دوم در بیان شش

میرزا اہلی شیرازی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

جانم بروزِ واقعہ پہلوے او کنید او قبلۂ من است۔ رخم سوئے او کنید

او قبلۂ من است اور رخم سوئے او کنید کا معمّا اس وقت حل ہوا جب میرزا اہلی شیرازی کو خواجہ حافظ شیرازی کے پہلو میں جگہ ملی۔ اور سنگ مزار پر یہی غزل کندہ ہوئی، رحلتِ حافظ کی تاریخ خاکِ مصلّیٰ (۷۹۲) اور رحلت اہلی کی تاریخ بادشاہِ شعرا بود اہلی (۹۴۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایران میں ڈیڑھ سو برس تک ایک شخص بھی اس اہلیت کا نہ مل سکا کہ حافظ کے پہلو میں جگہ پاتا۔ اس کا اہل صرف اہلی شیرازی تھا جو عالمِ غیب میں آج تک حضرت لسان الغیب سے غیب کی باتیں کر رہا ہے۔

میرزا اہلی شیرازی کا برادرِ عینی میرزا محمد ہاشم شیرازی۔ ہاشم کا چراغ ملا محمد رفیع شیرازی۔ رفیع کا پارۂ دل ملا غلام محمد شیرازی۔ ملا غلام محمد کا ماہِ دو ہفتہ میرزا غلام حسین[1]۔ یہ چاند اکبر آباد میں دیکھا۔ یعنی حضرت جلال الدین شاہ عالم بادشاہ غازی نے ۱۰۱۸ھ جلوس میں اس بچہ کی پیدائش کی خبر سنی تو پرورش کے لئے خزانۂ عامرہ سے ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ عطا فرمایا۔ فرمان شاہی مورخۂ رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ ہجری کے الفاظ یہ ہیں:۔

دریں وقت میمنت اقتران از وقایع مولود فرزندِ ملا غلام محمد نوادہ ملا ہاشم شیرازی دنام نہاد بمسمّیٰ غلام حسین بہ سمع ہمایوں رسیدہ۔ حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازنِ خزانۂ عامرہ سلطانی بارشاد ماموری یکصد روپیہ سکۂ کہن ماہانہ مصارف

---

[1] جس میرزا غلام حسین کی پرورش خود حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی نے کی اُس کو مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ تعصب کی راہ سے کاغذ ۴۵

مرصعہ وغیرہ ہم شرف صدور فرمودہ۔۔۔۔۔۔"

میرزا غلام حسین کا لختِ جگر میرزا سلامت علی وہ سلامت علی جس کے گھر دولتِ سیادت بھی ہاتھ باندھے آئی۔ یعنی

---

۳۴ فروش لکھنوی لکھتے ہیں (تذکرۂ سخن شعرا۔ص ۱۵۸) میرزا غلام حسین کا سنگین جرم یہ تھا کہ مرزا دبیر لکھنوی کے وہ باپ تھے اور مرزا دبیر کا سنگین جرم یہ تھا کہ لیلائے شاعری اُن کے قدم چومتی تھی۔ نساخ کو اس کی تاب کہاں ؟ نساخ کا ادنیٰ کمال یہ ہے کہ شہنشاہ اقلیم سخن میر انیس کے بارے میں فرماتے ہیں (ص ۵۶):۔ "سوائے مرثیہ کے اور کسی فن میں مطلق دخل نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو" اور پھر میر انیس کی رسوائی کے لئے نمونۂ کلام میں صرف تین شعر دئے

ہوا ہے۔ ابر ہے۔ ساقی ہے۔ مے ہے — پراک تو ہی نہیں۔ افسوس۔ ہے ہے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی — نور تن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا — آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

حضرت غالب نے اسی موقع کے لئے کہا تھا ؎ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے!

نساخ کو اکثر فضلائے روزگار سے خلش تھی۔ حضرت شاہ اُلفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی کے بارے میں پہلے تو یہ لکھا کہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں اور پھر انتخاب میں صرف دو شعر دئے جس میں ایک شعر یہ ہے (ص ۳۶۷)

نفس کو نالۂ دل سے اسیرِ درد کرتے ہیں — صبا کے پاؤں میں زنجیر بوئے گل سے بھرتے ہیں

مصرعۂ ثانی مہمل ہے کیونکہ زنجیر بھرنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ مگر نساخ کو ثابت بھی یہی کرنا ہے کہ فریاد عظیم آبادی اگرچہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں مگر جاہل ہیں۔

نساخ نے میر انیس و میرزا دبیر کے کلام میں غلطیاں نکالیں اور رسالۂ انتخاب نقص شایع کیا۔ اس کا جواب حضرت ناسخ کے شاگرد مرزا محمد رضا معجز نے رسالۂ نسخ النساخ میں دیا مطبوعہ ۱۲۹۶ ہجری مطبع شعلۂ طور کانپور۔ اعتراضات نساخ کا نمونہ یہ ہے:۔

یاں تیغ جگر بندِ علی میان سے نکلی — کس زرق سے کس برق سے کس شان سے نکلی

(میر انیس)

اعتراض یہ تھا کہ توابع کا جدا ہونا جائز نہیں۔ اس لئے زرق برق کو جدا کرنا غلط ہے۔ جواب دیا گیا کہ فارسی میں توابع کے درمیان واؤ عاطفہ لاتے ہیں مثلاً زرق و برق گفت و شنید اور اسی کا نام جدا کرنا ہے۔ چنانچہ خانِ آرزو کا فیصلہ ہو چکا ہے:۔

"انچہ نوشتہ کہ تابع بہ عطف مستعمل نہ شود غلط صریح است"

اور میر انیس کی طرح نیشاپوری بھی فرماتے ہیں ؎

زد سخن بر لبِ نظیری خوش — عشق در گفت و در شنود آمد

سیدہ بی بی بلبل ہزار داستان میر انشار اللہ خاں کی حقیقی نواسی ۔ سیدہ بی بی بنت میر معصوم علی اور معصوم علی ؟

بود او زدوج دختر انشا سید و شاعر فصیح زباں ؟

میرزا سلامت علی کون ؟ تخلص دبیر ۔ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر ۔ استاد ضمیر اپنے شاگرد دبیر کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جاتا ہے ۔ پھولا نہیں سماتا ۔ خط میں لکھتا ہے :" برہانِ من ۔ اسنادِ من ۔ اعتضادِ من ۔ اعتمادِ من سلمہ اللہ تعالیٰ "

میرزا سلامت علی دبیر وہ ہیں جن کے [illegible]موں کی فہرست میں خود سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان حضرت جانِ عالم محمد واجد علی شاہ نے اپنا نام لکھوایا تھا ۔ ثبوت ؟ ثبوت یہ کہ :-

" ..... روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیحضرت بخواندن مرثیہ اتفاق ۔ افتاد ناگاہ شامیانہ بالائے منبر ہمچو ابرِ رحمت سایہ گستر بود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسو شد و عکس آفتاب بر روی آنجناب اُفتاد ۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ ، وچوبش بدست خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند ۔ ..... "

شمس الضحیٰ مصنفہ مولوی صفدر حسین صـ۱۶۶

لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ مجلس عزا میں ایک دن اعلیحضرت واجد علی شاہ بھی شریک تھے ۔ منبر پر میرزا دبیر ۔ بالائے سر شامیانہ اتنے میں ہوا جو زور سے چلی تو شامیانہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اعلیحضرت نے دیکھا کہ میرزا دبیر کے رخ پر دھوپ ہے ۔ فوراً چتر شاہی طلب فرمایا خود اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ منبر کے پاس تشریف لے گئے ۔ اپنے ہاتھ میں چتر لیا ۔ اور میرزا دبیر کے سر پر سایہ کیا ۔ جب تک تاجدارِ ملکِ سخن منبر پر جلوہ فرما رہا تب تک تاجدارِ ملکِ اودھ چتر برداری کی خدمت بجا لاتا رہا ۔

ناز برداری اس کو کہتے ہیں ۔ مجنوں بھی لیلیٰ کی کفش برداری کرتا تو اس سے زیادہ کیا کرتا ؟ ۔ اودھ کی تباہی کے بعد ۱۲۷۴ھ ہجری میں جب امام باندی بیگم صاحبہ نے میرزا دبیر کو عظیم آباد آنے کی تکلیف دی ۔ اور میرزا دبیر منبر پر تشریف لے گئے تو یہ رباعی پڑھی ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے اس دور میں جور آسماں سے نکلے

صد شکر کہ شہر لکھنؤ تھا جنت آدم ٹھہرے ۔ جو ہم جناں سے نکلے

مطلب یہ کہ جب تک جنت تھی تب تک عالم سرور تھا ۔ بیداری کیسی ؟ عالم خواب تھا ! ہم کون ہیں ؟ یہ جانتا کون تھا ؟ جب وہ جنت چھن گئی تب آنکھ کھلی ۔ مدہوشی کیسی ؟ خمار تھا ! آدم کو اب معلوم ہوا کہ وہ آدم ہے ۔ آدم کی پہچان یہی ہے کہ وہ جنت سے نکالا جائے ۔ جو نکالا نہیں گیا وہ آدم نہیں ۔

میرزا دبیر نے ایک دوسری رباعی امام باندی بیگم کے امام باڑہ میں پڑھی اس کا چوتھا مصرع تھا ؎

پختہ جو ثمر ہوا ۔ چمن سے نکلا !

مطلب یہ کہ پھل جب تک لکھنؤ میں تھا خام تھا ۔ خام کو پوچھتا کون ہے ؟ پھل جب پوچھنے کے قابل ہوا تو

گاہک بھی دوڑ آیا۔ گاہک کون کہ عظیم آباد۔ اس گاہک کو دیکھو کہ ڈالی ہاں ہاں کرتی ہی رہی اور یہ پھل توڑ ہی لایا۔ مگر اس کارروائی کیا؟ ڈالی سے جدائی تو پھل کی قسمت میں روز ازل سے لکھی ہوئی ہے۔

جس روز یہ رباعی گلزار باغ میں پڑھی گئی اُسی روز سہ پہر کو بانکی پور میں چوہٹہ پر میر اسمٰعیل کے ہاں مجلس تھی مجمع تھا مگر مجلس شروع نہیں ہوئی تھی۔ لوگ ابھی آرہے تھے۔ مجلس میں میرزا دبیر پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ میر جان علی اصدقی عظیم آبادی شاگرد نثار علی وکیل عدالت باقر گنج نے کہا۔ صاحبو! میرزا نے فرماتے ہیں ؎ "پختہ جو تم ہوا۔ چمن سے نکلا" سوال یہ ہے کہ چمن میں پھول ہوتا ہے یا پھل؟ سب کے کان کھڑے ہوئے۔ ہر طرف سے آواز آئی کہ۔ پھول! پھول! پھول! ۔ مگر ایک اجنبی جو ابھی ابھی صحن میں داخل ہوا تھا بول اُٹھا کہ۔ پھول بھی۔ پھل بھی! حضرت سودا فرماتے ہیں ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن! کچھ تو ادھر بھی

اجنبی کو مجمع نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پوچھا آپ کون؟ اجنبی نے جواب دیا ؎

انتخاب زمانہ ہوں میں صفیر — کہ وطن بلگرام ہے میرا

وہاں عصائے موسیٰ نے دریائے نیل کو، اور یہاں اس واقعہ نے بانکی پور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اہلِ یقین اور اہلِ شک۔

اہلِ یقین صفیر بلگرامی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ میر جان علی اصدقی پہلے خود شاگرد ہوئے۔ پھر میر رفعت حسین و میر کفایت حسین اپنے بھانجوں کو اُستاد کی خدمت میں پیش کیا۔ بڑے بھانجے نے کبیر اور چھوٹے نے صغیر تخلص فرمایا۔ مولوی محمد بخش شائق عظیم آبادی نے اصرار کیا کہ عظیم الاخبار کا کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں۔ نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑہ مقیم باقر گنج نے کہا کہ ڈپٹی سید حسین علی کو آپ کی میزبانی کا کوئی حق نہیں ہے۔ خاندانی مراسم کی رو سے یہ حق ہمارا ہے۔ اسی طرح سیکڑوں قدرداں پیدا ہو گئے۔ اور اس قدردانی نے صفیر بلگرامی کو آرہ نہیں جانے دیا۔ اسی زمانے میں نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑھ کی فرمائش سے صفیر بلگرامی نے آٹھ سو صفحوں کی ایک کتاب فارسی زبان میں، مرغوب القلوب نام، مذہب و اخلاق میں تالیف کی۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

گویند وقتے ابلیس نزد فرعون آمد۔ وشانے انگور در دست گرفتہ بود۔ بفرعون گفت کہ ہیچ کس می تواند کہ ایں خوشہ را مروارید کند؟ فرعون گفت نہ ابلیس در حال یک دم بدمید۔ مروارید گشت۔ فرعون تعجب کرد و گفت عجب اُستاد مردی۔ ابلیس سیلی بر گردن فرعون نبرد و گفت مرا ایں اُستادی

ابلیس ہاتھ میں انگور کا خوشہ لئے ہوئے ایک مرتبہ فرعون کے پاس پہونچا پوچھا — ہے کوئی یہاں ایسا جوان انگور کے دانوں کو موتی کر دے؟ فرعون نے کہا۔ نہیں! تب ابلیس نے ایک ہی پھونک میں خوشۂ انگور کو موتیوں کا گچھا بنا دیا۔ فرعون کو بڑا اچنبھا ہوا۔ کہا کہ اوستادی اسکو کہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ابلیس نے فرعون کی گردن پر ایک مکا مارا۔ اور کہا — مردود! اس اُستادی پر بھی تو بندگی ہماری اُس

بہ بندگی قبول نہ کردد تو بایں نادانی دعوئ خدائی چوں کنی ؟	جناب میں قبول نہیں ہوئی - اور تو ابو جہل ہو کر آیا ہے خدائی کا دعویٰ کرنے ؟

صفیر بلگرامی کی کتاب مرغوب القلوب ایک مرتبہ نواب سہراب جنگ بہادر نے نواب سید الطاف حسین خاں سے دیکھنے کو لی - اور اس رقعہ کے ساتھ واپس کی :-

" الطاف گستر بے پایاں - سلامت !

اخلاص پرست یکرنگ، بندۂ بے ریائے سہراب جنگ بدیں رنگ مدعا طراز - نسخۂ مرغوب القلوب کہ جہت مطالعہ ازاں الطاف گستر آوردہ بودم الاول الآخرہ مطالعہ نمودہ بصحابت حامل واپس می دارم ---- بمطالعہ نسخہ مذکور خیلے محظوظ شدم - مؤلف را و آں شفیق را کہ بانیٔ تالیف ہستند، بدعائے خیر یاد کردم - وشک نیست کہ آں الطاف گستر از تالیف کنانیدن نسخہ مذکور خیلے ماجور و مثاب شدند - خدا جزائے خیر دہاد - بہ محمد و آلہ الامجاد -

زیادہ والسلام خیر الانام - سہراب جنگ عفی عنہ - یوم الادینہ"

اس رقعہ سے معلوم ہوگا کہ آج سے ستر برس پہلے بانکی پور اور عظیم آباد کی کیا فضا تھی - غالب فرماتے ہیں :- ؎

جاہ زعلم و بے خبر - علم زجاہ بے نیاز

مگر یہ رقعہ شاہد ہے کہ نواب سہراب جنگ بہادر کے ایسے ذیجاہ بھی علم سے باخبر تھے - اہل علم کی قدر کرتے تھے - عربی و فارسی تصانیف کے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے - منشیانہ فارسی قلم برداشتہ لکھتے تھے اور شب و روز فضائے علم میں بسر کرتے تھے - یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی خزاں بہار پر تھی - اور بہار کی ملکہ پچھم سے منہ موڑ کر پورب میں یعنی عظیم آباد میں جلوہ فرما تھی ؎

چمن آتش گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ کسی بیرونی شخص کا عظیم آباد میں فروغ پانا آسان نہ تھا -

چنانچہ اہل شک نے کہا کہ بلگرام خطۂ یونان سہی مگر بغیر اچھی طرح سمجھے بوجھے کسی کو یوں ہی مان لینا درست نہیں - اس فیصلہ کی رو سے باقر گنج دارالامتحان قرار پایا - اور میر حشمت علی حشمت کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے مشاعرے نہیں، معرکے شروع ہوئے - یہ آگ بڑھتے بڑھتے شہر عظیم آباد پہونچی - وہاں ایک مرتبہ محلۂ گزری میں نواب سید محمد حسین خاں ہجرتی شاگرد ناظر وزیر علی عبرتی کے ہاں مشاعرہ تھا - یہ عظیم آباد کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں صفیر بلگرامی کی شرکت ہوئی - طرح میں جو غزل انھوں نے پڑھی بہت دقیق تھی - اہل شک کو موقع ملا - مولوی یوسف علی شہید شاگرد نجم نے کہا کہ سر مشاعرہ امتحان ہونا چاہئے - صفیر بلگرامی نے کہا کہ بسم اللہ ! اسی وقت مشاعرہ میں دیوان ناسخ لایا گیا - کھولا گیا تو یہ غزل نکلی ؎

ہے دلا کس کو دوام اس گردشِ افلاک میں — خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں
کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موجِ مے — پاک میں ہے کب وہ کیفیت جو ہے ناپاک میں
مست عالم کو کیا چشمِ سیاہ یار نے — ساغرِ مے کا ہے عالم ساغرِ تریاک میں

ممتحن نے خیال کیا کہ افلاک میں۔ خاک میں پامال زمین ہے۔ ممکن ہے صفیر بلگرامی کی غزل اس زمین میں پہلے سے موجود ہو۔ اور نہ بھی ہو تو وہ امتحان ہی کیا جس میں لوہے کے چنے نہ چبائے جائیں۔ اس لئے حضرت ناسخ کے ساتویں شعر کا مصرع دیا گیا۔ یعنی ؎ "کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موجِ مے"۔ صفیر بلگرامی نے فی البدیہہ ۲۱ شعر کی دو غزلیں کہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مستِ استغنا نہ ہو۔ سن لے بیانِ موجِ مے — ہے لبِ ساغر سے کچھ کہتی زبانِ موجِ مے
عکس تیرا جب پڑا ساقی میانِ موجِ مے — سایہ افگن خم سے ہوگا سائبانِ موجِ مے
دُردِ مے اس کی زمیں ہے۔ تو حبابِ مے فلک — دیکھ لے ساقی زمین و آسمانِ موجِ مے
پی کے مے سیرِ جہانِ لامکاں کر شوق سے — عالمِ امکاں سے باہر ہے جہانِ موجِ مے
چشمِ مست ساقیِ خود بیں ہے کیا جامِ شراب — آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہے گمانِ موجِ مے
جستجو اس کو ہے یہ کس یوسفِ گم گشتہ کی — گردشوں میں رات دن ہے کاروانِ موجِ مے
جس سے دو باتیں ہوئیں وہ مست بیخود ہو گیا — آپ کی موجِ تبسم میں ہے شانِ موجِ مے
عیش میں بھی بانکپن سفاک کا جاتا نہیں — وقت مے نوشی ہے ہاتھوں میں کمانِ موجِ مے
— اے صفیر اک اور لکھئے ابتو مستانہ غزل — یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موجِ مے —

صفیر بلگرامی یہ غزل کہہ کر اُٹھے تو یوسف علی شہید نے انگشت شہادت اُٹھائی اور کہا لاریب قادر الکلامی اسکو کہتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے مشاعرہ میں جوش نے کہا کہ شاعر ہم اُسی کو مانیں گے جو خنجر تہ خنجر باندھ کر دکھلا دے صفیر بلگرامی نے ۱۳ شعر کی فی البدیہہ غزل کہی۔ دس شعر یہ ہیں ؎

تھامے ہوں تری زلفِ معنبر تہ خنجر — ہے سلسلۂ عمرِ خضر ذرہ تہ خنجر
خنجر کو جو دیکھا تو بندھا ابروؤں کا دھیان — پڑھنے لگا میں بچھو کا منتر تہ خنجر
سفاک نے رگڑا جو دیا حلق پہ میرے — بل کھا گیا میں صورتِ خنجر تہ خنجر
قاتل مری میت پہ رہے تیغ کا سایہ — جائے بھی ترا کشتۂ خنجر تہ خنجر
سر دینا بھی مجھ عاشقِ جانباز کو ہے کھیل — دیکھا کیا میں جوہرِ خنجر تہ خنجر
جس طرح سے جی چاہے مجھے قتل کر ستم — تڑپوں گا نہ اے صاحبِ خنجر تہ خنجر

اک خنجر ابرو نہیں - پلکیں بھی ہیں نیچے رکھے ہیں وہاں سیکڑوں خنجر تہ خنجر
کہنے لگا سرمہ کی وہ تحریر دکھا کر خنجر تہ خنجر ہے یہ خنجر تہ خنجر
ہے جوش کو دعویٰ یہ کہ شاعر اُسے سمجھوں باندھے جو کوئی قافیہ خنجر تہ خنجر

شاعر مجھے کہتے ہیں صفیر سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہ خنجر

اسی طرح نئی نئی اور سنگلاخ زمینوں میں مشق امتحان لئے گئے - چنانچہ صفیر بلگرامی فرماتے ہیں ؎

کام رستم کا نہ تھا - جو کیا فردوسی نے نہیں ہر ایک سے کھنچتی ہے کمانِ شاعر

رستم یعنی ہفت خوانِ رستم - فردوسی یعنی شاہنامہ - مطلب یہ کہ رستم سے اگر کہا جاتا کہ کمانِ موج نے سے تیر اندازی کر اور جوہر خنجر تہ خنجر دکھلا تو وہ کمان اپنے ہاتھوں سے پھینک دیتا - اور خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتا - امتحان کبھی نہ دیتا - ہفت خوانِ رستم کو اُن سات امتحانوں سے کیا نسبت جو عظیم آباد میں لئے گئے - رستم فردوسی نہیں ہو سکتا - میدانِ جنگ میں آج سناٹا ہے - معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی عظیم آباد ہے، وہی گذری ہے، جہاں ہجرتی عظیم آبادی کے مشاعرے ہوتے تھے - شہید و جوش مسلح ہو کر آتے تھے - توپیں سر ہوتی تھیں چھتیں اُڑتی تھیں - دیواریں ناپید ہوتی تھیں - آج ہر طرف سناٹا ہے - بقول حضرت صفیر بلگرامی ؎

زمینِ سخن میں پڑے سو رہے ہیں شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے !

ان شہیدانِ تیغِ سخن میں جناب بدر آروی بھی ہیں جن کی مدح میں میر عنایت حسین صاحب امداد عظیم آبادی شاگرد شاد عظیم آبادی فرماتے ہیں ؎

مرقع محنتوں کا ہے یہ دیواں ریاضت ہائے عمر بے وفا ہے یہ اب مقبول ارباب سخن ہو یہی امداد خستہ کی دعا ہے
نہ کیوں ہو شان اُستادی نمایاں کہ تصنیف بدر بے ریا ہے یہ وہ اہل ہنر ہے صاحب فن وطن میں اسکا شہرہ جا بجا ہے
خلیق و خوش مزاج و بامروت شکستہ نفس و خوشخو باوفا ہے نہ دیکھا انکسارِ نفس ایسا خودی جس میں نہ مطلق ادعا ہے

شکستگی نفس کے ثبوت میں جناب بدر آروی کا ایک خط ملاحظہ ہو :-

"عزیز گرامی مولوی سید وصی احمد صاحب بلگرامی - بخیریت رہکر نوید صحت مزاج کا خواستگار ہوں - میرا دیوان ۲۸ جزوں پر چھپ کر تیار ہو گیا ..... یہ دیوان آپ کے جد امجد (حضرت صفیر بلگرامی) بہشت مکان کی زندہ یادگار ہے - ناپسند ہونے پر بھی ایک جلد آپ کی الماری میں ہونا ضرور ہے -

بذلِ رنداں کردم از ساقی گرفتہ جام مل ! نذرِ سلطاں ساختم از باغِ سلطاں چند گل

حضرت اُستادی علیہ الرحمہ کی کفش برداری کا فیض ہے جو دیوان کی شکل میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے

آپ کی چیز ہے - آپ کے گھر کی چیز ہے ....."

سید محمد امیر حسن بدر

آرہ - یکم مارچ ۱۹۲۹ء روز جمعہ

اس خط میں زندہ یادگار کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ مختصر یہ کہ آج عظیم آباد کا میدانِ جنگ خموش ہے - مگر ستر پچھتر برس پہلے جو توپیں وہاں سر ہوئی تھیں اُن کا دھواں اب تک اُڑ رہا ہے - اُن معرکوں کی یاد اب تک تازہ ہے یعنی جن زمینوں میں صفیر بلگرامی کا عظیم آباد میں امتحان ہوا تھا اُن زمینوں [redacted] مدت دراز کے بعد جناب بدر نے اپنے اُستاد کی اجازت سے غزلیں کہیں اور پتھر کو پانی کی طرح بہا دیا ؎

صفیر بلگرامی	بدر آروی
(۱) شاعر مجھے کہتے ہیں صفیر سخن آرا یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر بہ خنجر	اے بدر بجا حضرت اُستاد کا ہی قول یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر بہ خنجر
(۲) اے صفیر اک اور لکھئے ابتو مستانہ غزل یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موج مے	بدر لکھتا ہوں ابھی اک اور مستانہ غزل ہے طبیعت موج پر اپنی بسان موج مے

زبانِ موجِ مے کی زمین میں حضرت صفیر بلگرامی نے ۲۱ شعر کہے تھے۔ جناب بدر نے ۸۱ شعر کہے اور ۳۱ قوافی باندھے - مثلاً استخوان - بادبان - داستان - نردبان وغیرہ - مگر امتحان سے قصداً پرہیز کیا - کیونکہ امتحان، اور وہ بھی سرِ مشاعرہ امتحان، اُستاد کا ہو چکا تھا۔ شاگرد کو اس کی نوبت نہیں آئی - اس لئے سعادتمند شاگرد نے اس قافیہ کو ہاتھ لگانا سوءِ ادب سمجھا۔

سہسرام کے ایک مشاعرہ میں جناب بدر کو داستانِ موج مے سُنانے کا اتفاق ہوا - اس کی خبر کسی نے جناب سید حسن مرتضیٰ شفق رضوی عماد پوری کو پہونچائی۔ ظالم آسمان شفق کو بدر سے کبھی ملنے نہیں دیتا مگر ایک مشاعرہ[1] میں یہ ناممکن بات بھی ممکن ہو گئی تو جناب شفق نے بدر سے کہا کہ داستانِ موجِ مے سننے کے لئے کان مشتاق ہیں۔

---

[1] اس مشاعرہ میں جناب شفق نے ایک رباعی کہی تھی جس کا پہلا اور دوسرا مصرع یہ ہے ؎

روشن ہے جہاں میں بدر سے نام صفیر ناچیز شفق ہے کفشِ بردارِ امیر

حضرت امیر مینائی کے پہلے جناب شفق کو شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ اُس زمانہ کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

۱- نوگرفتارِ محبت ہوں - ابھی کیا جانوں ! فرقت اچھی ہے کسی کی کہ وصال اچھا ہے

۲- کیا مزا ہو - انقلاب ایسا اگر ہو دہر میں میں تو روٹھوں اور وہ آئین مٹانے کے لئے

اس داستان کو سنکر جناب شفق کے دل پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۴۷ھ ہجری میں خمخانۂ بدر طبع ہوا اور جناب شفق نے قطعۂ تاریخ کہا تو اُس قطعہ میں اس داستانِ موجِ مے کا خاص طور سے ذکر کیا ؎

بفضلہ الحمد آب و تاب طبع رنگیں سے شفق
صورتِ صحنِ چمن ہے گلفشاں دیوانِ بدر

ہے مئے جامِ کہن میں کہنہ مشقی کا اثر
ہست ہوں پڑھ کر نہ کیوں پیرِ جواں دیوانِ بدر

اس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ موجِ مے
کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ میکشاں دیوانِ بدر

جلوۂ حسنِ معانی سے دکھاتا ہے مجھے
لمعۂ فیضِ صفیر نکتہ داں دیوانِ بدر

حضرت ناسخ نے ۱۲۵۴ھ ہجری میں رحلت کی۔ یہ ۱۳۵۴ھ ہجری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کاروانِ موجِ مے اس ایک سو برس میں کن کن منزلوں سے گزرا ہے :۔

(۱) پہلی منزل لکھنؤ۔ محلہ ٹکسال۔ جہاں کلکِ ناسخ نے ایک شعر کے مصرعِ اول میں اتفاقیہ زبانِ موجِ مے لکھدیا

(۲) دوسری منزل عظیم آباد۔ محلہ گذری۔ جہاں بحرِ تی عظیم آبادی کے مشاعرہ میں یوسف علی شہید نے حضرت صفیر بلگرامی کا امتحان لینا چاہا۔ اور اس امتحان کے لئے دیوان ناسخ کھولا گیا تو عجب اتفاق کہ وہی مصرع طرح قرار پایا۔

(۳) تیسری منزل آرہ۔ ملکی محلہ۔ جہاں جناب بدر آروی نے مسلسل پانچ غزلیں کہہ کر دکھلایا کہ موجِ مے کتنی زبان دراز ہے

(۴) چوتھی منزل عماد پور۔ علاقہ رفیع گنج ضلع گیا۔ جہاں جناب شفق عماد پوری نے خمخانۂ بدر کی تاریخِ طبع کا قطعہ لکھا تو بیانِ موجِ مے آ ہی گیا۔ اور تماشہ کی بات یہ ہے کہ دیکھنے میں تو کاروانِ موجِ مے لکھنؤ سے عظیم آباد اور آرہ ہوتا ہوا گیا پہونچا، لیکن غور کیجئے تو یہ کارواں جس نقطہ سے چلا تھا ایک سو برس کے بعد پھر اُسی نقطہ پر آگیا۔ نقطۂ اول ناسخ کی ایک بیت کا پہلا مصرع۔ نقطۂ آخر شفق کی ایک بیت کا پہلا مصرع !

جناب شفق کے اس قطعہ کا ایک مصرع قابلِ توجہ ہے ؎ "لمعۂ فیضِ صفیر نکتہ داں دیوانِ بدر" یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس مصرع میں نکتہ داں محض قافیہ پیمائی ہے۔ جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جسکی مدح میں مرزا محمد باقر صحبت لاری شیرازی کے قصاید موجود ہیں۔ تین شعر ایک قصیدہ کے یہ ہیں ؎

کیست آں نخلِ نبی۔ شبل علی۔ میر صفیر
کہ درونش بصفا مجمع اسرار آمد

در فنِ شعر یکے کہنہ ادیبے است ادیب
کہ بوصفش قلم از شرح تبکرار آمد

دیدۂ دہم نیابد بہ سخن سنجیٔ او
انجم آسا اگرش خود ہمہ بصار آمد

جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کو حضرت غالب کے دربار سے نورِ بصر لختِ جگر قرۃ العینِ اسد خطاب ملا تھا۔ اور جس کو خود جناب شفق کے اُستاد حضرت امیر مینائی اپنے خطوں میں "بلبلِ شیراز و طوطیٔ ہند کے ہمصفیر"

لکھا کرتے تھے۔

راجہ کے بھنڈار میں اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔ بھنڈار کے ایک کونے میں مصری کا پہاڑ بھی ہے۔ چیونٹی کہتی ہے کہ یہ پہاڑ اپنے سر پر کیونکر اُٹھا لائیں۔ ہاں اپنی بساط بھر ایک ریزہ منہ میں داب کر لائے ہیں کہ مہمان بھوکے نہ اُٹھ جائیں۔

نمونۂ کلام حضرت صفیر بلگرامی۔

قطعہ

بڑے شوق سے بھیجتا ہوں میں قاصد — رہیگی نظر راہ پر دیکھ لینا — نہ تو خیر سے پھر کے آئیگا جب تک — نہ ٹھہریگا دل نے جگر دیکھ لینا

پتا کوئے قاتل کا بتلا دوں تجھکو — جو کہتا ہوں میں ڈھونڈ کر دیکھ لینا — پڑے ہر جگہ پر ہیں ٹکڑے جگر کے — تڑپتے ہیں دل خاک پر دیکھ لینا

کہیں خاک اُڑاتے ہیں گیسو کے اُلجھے — کسی کا ہے دم ہونٹھوں پر دیکھ لینا — خراشوں سے سینہ گلستاں کسی کا — کوئی گل ہے داغِ جگر - دیکھ لینا

کوئی ہوگا اینڑی رگڑتا زمیں پر — کسی کا عدم کو سفر دیکھ لینا — کہیں چاک دامن کئے ہیں ہزاروں — کھڑے ہیں کہیں بخیہ گر دیکھ لینا

کوئی شامِ غم میں مگر غمگسارِ کلفت — کسی لب پہ آہِ سحر دیکھ لینا — ہلا دیں گے دل تیرا اٹھ کے کسی کے — کسی کی فغاں بے اثر دیکھ لینا

کوئی ہوگا دھونی رمائے وہاں پر — کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا — نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پانی کی پروا — غذا سب کی خونِ جگر - دیکھ لینا

۱؎ فہرست تصانیف حضرت صفیر بلگرامی تا سنہ ۱۲۹۴ ہجری

نظم

دیوان	فارسی ۳ - اُردو ۸	
مثنویات	فارسی ۴ - اُردو ۲۶	
قصائد	فارسی ۲ - اُردو ۴	
کلیات مولود و مراثی		۲ جلد
دیوان خمسہ جات		۱ جلد
دیوان رباعیات		۱ جلد
قطعات		۱ جلد
واسوخت		۴ جلد - نظم مختلف - ۱ جلد

نثر

بوستانِ خیال	۱۸ جلد	سراج العقول	۱ جلد
فیض صفیر	۲۱ "	فالنامہ	۱ "
تذکرہ مردم دیدہ	۱ "	ترجمہ تفسیر	۱ "
مضامین مختلف	۷۵	ترجمہ کتب مختلفہ	۵ "
گلبن موزوں	۳۳		
قصص	۷		
مرغوب القلوب	۱ جلد		
جوہر مقالات	۳ جلد		

کہیں ہڈیاں طائرِ نامہ بر کی — کسی جا کبوتر کے پر۔ دیکھ لینا
یہ ساماں گلی میں وہ کوٹھے پہ ہونگے — پھری ہو گی سب سے نظر۔ دیکھ لینا
لحد ایک حسرت بھری عین در پر — لکھا شعر یہ لوح پر۔ دیکھ لینا
تجھے اپنی آنکھوں کی سوگند قاتل — مری قبر روز اک نظر۔ دیکھ لینا

غزل

آنکھ میں دل میں کرم فرمائیں آپ — آئیں آپ۔ اے بندہ پرور آئیں آپ
حالِ دل میرا اگر سنتے نہیں آپ — بے بلائے آپ دوڑے آئیں آپ
ہمکو کیا۔ غیروں کے آگے جائیں آپ — پائے نظارہ کی ٹھوکر کھائیں آپ
یہ سکھاتی ہے اُن آنکھوں کو حیا — شرم بھی آئے تو شرما جائیں آپ
خط کے آنے پر خط آیا آپ کا — اس کے معنی کیا۔ ذرا بتلائیں آپ
زندگی بھر تو جلایا ہے مجھے! — شمع مرقد بھی جلانے آئیں آپ

لہ یہ کوٹھا وہی کوٹھا ہے جو عرش سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کوٹھے کے نیچے زنجیروں کی جھنکار ہے۔ تیروں کی بوچھار ہے۔ رسن ہے۔ دار ہے۔ خون کی ندیاں ہیں۔ ظلم کی بجلیاں ہیں ——— ماہِ کنعاں قیدخانہ جا رہا ہے۔ زلیخا کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے ——— سید الشہدا ایک شیر خوار کو ہاتھوں پر لئے ہوئے فریاد کر رہا ہے "ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں" حرملہ کا تیر علی اصغر کی پیاس بجھانے آتا ہے۔ ادھر معصوم کے حلق سے خون کا فوارہ چھٹ رہا ہے اور اُدھر فوجِ یزید میں عید قربان ہے ——— ایک ماں اپنی گڈری کے لعل کو صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کو سونپ رہی ہے اور صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جا رہا ہے ——— اللہ کا ایک فرماں بردار غلام یہودیوں کے نرغہ میں ہے اور اس غلام کے لئے سولی کھڑی کی گئی ہے ——— سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے اور تاجدارِ شہدِ مقدس کو زہر آلود انگور بھیجے جا رہے ہیں ——— ایک میدان میں کبوتر کے پر بھی ہیں۔ جس کو شک ہو وہ آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ کہیں عباس علمدار کے دست بریدہ ہیں۔ کہیں علی اکبر کا تنِ بے سر ہے۔ کہیں حبیب ابن مظاہر کا سر بے تن ہے۔ یہ میدانِ کرب و میدانِ بلا ہے۔ یعنی کربلا ہے۔

گلی میں یہ سامان فدائیوں کی یہ شان اور کوٹھے والا دیکھتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ بے نیاز ہے۔ دیکھتا نہیں مگر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ اسی دن کے لئے اُس نے آگ کو حکم دیا تھا کہ مٹی کو سجدہ کر! مٹی کا وزن آگ سے زیادہ ہے۔ مگر مٹی کہیں اترا نہ جائے غرور نہ کر بیٹھے۔ اس لئے ؎

"پھری ہو گی سب سے نظر دیکھ لینا"

آرزو بھی اپنی نکلے دم کے ساتھ
وصل قسمت میں نہیں ہے۔ کیا کریں
ہو گئے یکتا لطافت کے سبب
ہائے رے گردن جھکانا آپ کا
دفن میں تجھکو تردد ہو اگر!
وجد میں آکر لحد ہلنے لگے

نزع میں دم بھر اگر ہو جائیں آپ
آپ کھو جائیں اگر مل جائیں آپ
آئینہ میں عکس کیونکر پائیں آپ
اک ذرا پھر اس طرح شرمائیں آپ
تیرے کہتے شرم سے گڑ جائیں آپ
اپنے پاؤں سے اگر ٹھکرائیں آپ

بلبلیں گائیں گی یہ غزلیں صفیر
شعر اچھے اچھے کہتے جائیں آپ

جائیں آپ اب، جائیں آپ اب، جائیں آپ
گور میں رکھوالیں تو گھر جائیں آپ
شاعروں سے لڑتی ہیں آنکھیں بہت
آنکھ سے میرا مکانِ دل ہے خوب
زرد ہوں۔ لیکن گھرا ہوں عشق میں
ڈر ہے جذبہ سے مرے۔ کیا دور ہے
حضرتِ دل کیا مجھے بھاری ہے جان؟
میں تمھیں دیکھوں۔ وہ دیکھے غیر کو
کب سے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اے حضور
تم سے چھٹ کر دل بہت کرتا ہے تنگ
دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں سامنے
بسمل اُٹھ اُٹھ کر لپٹتے ہیں حضور
گل تو بلبل کو ملے۔ قمری کو سرو
غیر مجھ سے لڑ رہا ہے دیر سے
منھ چھپایا خال کے بوسوں پہ بھی
آپ دیکھیں جو دکھاتے ہیں مجھے
شعر ہیں ان بحروں کے موتی صفیر

چار غیروں میں نہ یوں فرمائیں آپ
بیٹھ کے لاشہ مرا اُٹھوائیں آپ
دیکھئے ایسا نہ ہو بندھ جائیں آپ
ابتو اس کوٹھے سے نیچے آئیں آپ
خوب اس سونے کو میرے تائیں آپ
بے طلب گھر میرے دوڑے آئیں آپ
خنجرِ ابرو کی چوٹیں کھائیں آپ
اب تو اپنی آنکھ سے شرمائیں آپ
پھر چکے خوب۔ اپنے گھر میں آئیں آپ
اس کو بھی ساتھ اپنے لیتے جائیں آپ
اچھا اچھا کچھ چھپاتے جائیں آپ
عید کے دن دیکھتے تو جائیں آپ
یا الٰہی مجھ کو بھی مل جائیں آپ
اور آکر ہاں میں ہاں ملوائیں آپ
کوئلوں پر تھُہر اب دلوائیں آپ
آپ سمجھیں مجھ کو جو سمجھائیں آپ
جوہری بازار میں لے جائیں آپ

ہجر آیا - وصلِ جاناں الغیاث! تیرہ شب ہے - ماہِ تاباں الغیاث!
دل لئے کب سے کھڑا ہوں ہاتھ میں الغیاث اے تیرِ مژگاں الغیاث!
ہم سے مفلس چاہتے ہیں انقلاب الغیاث اے چرخِ گرداں الغیاث!
رات فرقت کی نہیں کٹتی ہے - آہ الغیاث اے مہرِ رخشاں الغیاث!
اُن کے در سے اب اُٹھا تیں رقیب الغیاث اے کوئے جاناں الغیاث!
زلفِ شبگوں نے کیا عالم تباہ الغیاث اے روئے تاباں الغیاث!
بھر گیا ہے دل میں جاناں کے غبار الغیاث اے ابرِ مژگاں الغیاث!

قابلِ امداد ہے اب تو صفیر
الغیاث اے شاہِ مرداں الغیاث!

میرے آگے غیر سے اس طرح یارانے کی بات واقعی ہے اے ستمگر یہ تو مر جانے کی بات
واقعی ہے اے محبت آگ ہو جانے کی بات کیوں نکالی اُن کے گھر میں میرے ویرانے کی بات
جب کہا حیرت ہے - میں تم پر فدا - تم غیر پر ہنس کے بولے - اپنے اپنے دل کے آجانے کی بات
میرے منہ سے اور شکوہ آپ کا - اچھی کہی کیا خیال آیا یہ ہی صاحب کے فرمانے کی بات
ایک بھی منہ سے نہ چھوٹا - ہو گئے پتھر یہ بت زاہد و تم کو سناؤں کیا میں تبخانے کی بات
شب کو ایسا ارتباط - اور صبح ایسی احتیاط اے صنم سچ ہو کہ ہو یہ دل میں آجانے کی بات

اے صفیر اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے؟
جل بجھا کل رات - دیکھی تم نے پروانے کی بات!

شمع و پروانہ کا ذکرِ خیر آ ہی گیا تو غازی پور اور الہ آباد کا ایک فسانہ بھی سُن لیجئے - مولوی عبدالصمد صمد غازی پوری نے ۱۲۹۱ھ میں صفیر بلگرامی کو مدعو کیا - صفیر بلگرامی غازی پور پہونچے اور للن نے ان کا آنا سنا تو ملنے کے لئے آئی - ان کو معلوم تھا کہ للن ملک الموت ہے اور سید کاظم علی مضطر الہ آباد میں موت کی راہ دیکھ رہے ہیں - چنانچہ للن سامنے آئی تو دیکھتے ہی صفیر بلگرامی نے پوچھا - ؎ "کیا ہوئی عاشقِ مضطر کی یاد"؟ اس کا جواب للن کی زبان اور صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے ؎

سن کے آنکھوں کو پھرایا اُس نے عجب انداز دکھایا اُس نے بولے اُس بت کے لبِ شکر خند کیا یہ کہتے ہو - خدا کی سوگند
جلوۂ طورِ صفا کی سوگند جذبۂ اہلِ وفا کی سوگند اپنی شرم اور حیا کی سوگند انکی مہر اور وفا کی سوگند
شوخ چشموں کے غضب کی سوگند پیار کی نظروں کے ڈھب کی سوگند حسنِ بے پردہ کی ضو کی سوگند شمعِ رخسار کی لو کی سوگند
بسملِ تیغِ نگہ کی سوگند! زخم کاری کی جگہ کی سوگند غمزۂ شوخ روش کی سوگند نظرِ نیم خلش کی سوگند
اپنے مژگاں کی خلش کی سوگند دل مضطر کی طپش کی سوگند

گرم جوشوں کی محبت کی قسم
سرد مہروں کی عداوت کی قسم
سست عہدی حسینانکی قسم
حسرتِ گوشہ گزینانکی قسم

شعلۂ شمع فروزاں کی قسم
عشق پروانۂ سوزاں کی قسم
سینہ کاویِ نظارہ کی قسم
دل جانبازو دو پارہ کی قسم

عشق کی بے خطر آہوں کی قسم
حُسن کی نیچی نگاہوں کی قسم
خونچکاں نالۂ بلبل کی قسم
خونفشانیِ رگِ گل کی قسم

اپنے انجانِ تغافل کی قسم
اُن کے سامانِ تجمل کی قسم
اپنے گیسوئے دل آرا کی قسم
اُسی آشفتہ و شیدا کی قسم

کہ مرے دل کا وہی عالم ہے
جانِ بسمل کا وہی عالم ہے

رات دن آنکھ نہیں ہے دھیان اُنکا
وہ نہ خط بھیجیں پیغام بھیجیں
دور اُفتادوں سے سچ ہے کیا کام

زندگی اپنی کٹے تو کیونکر؟
طعن و تشنیع کہانتک سنئے؟
کبتک اس راہ میں تنکے چنئے؟

سامنے ہے وہ دل آرا ہر دم
کہہ کے یہ بوسہ زنِ لب ہوئی آہ
دفعتاً اُس کا ہوا حال تباہ

کھولدی اُسنے کبھی زلف جو بکھری چوٹی
ہاتھ مل مل کے چھڑائی منہدی
ایڑیاں گھس کے اُڑائی منہدی

دست بوسی جو گریبان نے کی
تا گریباں جو وہ داماں پہونچا
تا بہ دل چاک گریباں پہونچا

مجھکو وحشت ہوئی اس حالت پر
دوستانہ اُسے سمجھانے لگا
اتنے میں غش بھی اُسے آنے لگا

اُسکی ایسی ہوئی حالت تغییر
میں نے منگوا کے سواری اُسدم
بھیجا گھر اُس کے بصد رنج و الم

ایسے بیمار سنبھلتے ہیں کہیں؟
میں نے مضطر کو روانہ کیا خط
اطلاع اسکی مناسب تھی فقط

بعد دو سال کے معلوم ہوا
کھا گئی اُس کو تمنا دل کی
جانِ مضطر ہوئی کشتہ دل کی

جان اُسکی ہدفِ غم جو ہوئی
مرغ جاں اُس کا فلک سیر ہوا
لیجئے - خاتمہ بالخیر ہوا

مجھ پہ تھا حقِ محبت جو صفیر
حال میں نے کیا اُس کا تحریر
یادگار اُس کے ہیں یہ چند اشعار
بخشے اب اُسکو خدائے غفار!

غزل

اوڑھے ڈسنا فعیٔ زلفِ دوسر کا کھیل ہے
وحشیوں کو رو کنا تیری نظر کا کھیل ہے

لختِ دل کا کھیل ہے اور اشکِ تر کا کھیل ہے
عشق کے بازار میں لعل و گہر کا کھیل ہے

کاسۂ سر ہاتھ میں لیکر چلا منصور کیا
یہ تو ادنیٰ عاشقِ آشفتہ سر کا کھیل ہے

طبعِ معنی یاب بھی درکار ہے اس کو صفیر
شاعری میں کیا فقط علم و ہنر کا کھیل ہے

مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعہ میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست مورخہ ۱۲۹۴ھ میں اُنھیں شاگردوں کو جگہ ملی تھی جن پر صفیر بلگرامی نے برسوں محنت کی تھی۔ ۲۹ شعر میں ۱۶ یہ ہیں ؎

میر فہر زند احمد آنکہ صفیر — ہست مشہور عالم ایجاد — بلگرام اصل دآرہ مسکن او — سالہا منزلش عظیم آباد
طوطیٔ خوشنوائے گلشنِ نظم — بلبلِ نغمہ سنجِ گلبن داد — ہم زپیرایگی خزینہ کشا — ہم زقید غرور ہست آزاد
نامور در جہاں تلامذہ اش — بہرہ ور صاحبانِ استعداد — مایہ دار از فیوض او شاگرد — ہم ز تعلیم اوست شاد استاد
فیض یاب از صفیر باتمکیں — سخن احمد امیر سلطاں شاد — مخلص و شورش اکبر و اصغر — ہاشم و محسن خجستہ نہاد
صاف و عنقا ہما امیر اخلاص — ہم شمیم و کلیم طوبیٰ زاد — حسن اکبر حقیر درد ظہیر — ہم گرامی ضیائے مہر سداد
سخن اکرام قیصر و جہاد و — ہم سلیم و زریر صاحب داد — حسن و جوش و حیرت و فیاض — ہم طبیب و متین نیک نہاد
اہل صغیر و مطیر تمکیں شور — آل عنایت کبیر ہم فرہاد — جاہ یحییٰ غلام لائق نیز — احمدی و حکیم و ہم ایجاد
قاصر و باقر و ثریا مہر — دانش و ہم ذکی عالی زاد — آل نہال و جمیل و محزوں نیز — باز مداح لائق ارشاد

ضلع شاہ آباد میں جو لوگ شاگرد ہوئے اُن سے قطع نظر کرکے باقی اور شاگردوں کا مختصر حال یہ ہے :-

سخن خواجہ سید محمد فخر الدین حسین خاں۔ خلف خواجہ محمد جلال الدین عرف حضرت صاحب خلف خواجہ فقیر صاحب چشتی مودودی سجادہ نشین مقام لکھنؤ۔ سال غدر میں یہ اپنے عم نامدار مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ آرہ آئے۔ عمر تقریباً پندرہ برس۔ مرزا صاحب موصوف نے ان کو حضرت صفیر بلگرامی سے ملایا۔ اسی زمانہ میں ان کو ایک فسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ مگر سکۂ رائج الوقت فسانۂ عجائب تھا جس کی شاعرانہ خصوصیات کا برتنا اور قیود و قوانین سے عہدہ برآ ہونا بچوں اور نوشقوں کا کام نہیں تھا۔ انھیں مجبوریوں سے جناب خواجہ فخر الدین حسین خاں نے نظم و نثر میں صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی کیونکہ اس صوبہ میں اُسوقت صفیر بلگرامی کی جگہ پرستارانِ اُردو کی صفِ اول میں تھی۔ بہرکیف خواجہ صاحب نے اُستاد سے سخن تخلص پایا معمول یہ ہوا کہ جناب سخن اپنے فسانہ کا ایک یا دو ورق لکھ کر روزانہ اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جس روز خود نہ آسکتے سہدیوں پیادہ کے ہاتھ اوراق بھیج دیتے۔ سال بھر کی محنت میں وہ فسانہ ختم ہوا۔ یعنی ۱۲۷۶ھ میں چنانچہ تاریخی نام سروش سخن ہوا۔ اس کے دو برس کے بعد خواجہ صاحب نے وکالت کا امتحان دیا۔ اور آرہ میں وکالت شروع کی۔ پھر منصف اور صدر اعلیٰ ہوئے۔

سروش سخن کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے اُستاد حضرت غالب دہلوی کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجا تھا:-

"..... ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخر الدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور ننہال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بعمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے۔ اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے، اور مجھ سے تلمذ کیا، اور قصہ مسمی بہ سروش سخن جس کو اُن کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چونکہ اُس قصہ کو چھپنا چاہئے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھکر کون ہے، اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اُس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے

اور طبیعت اُن کی (سخن کی) اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کو آئی ہے۔ اُس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا۔ وہ یہ ہے ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس خط کا جواب حضرت غالب نے یہ دیا:-

"مولوی سید فرزند احمد۔ ..... اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہونچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستر واں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے ؎

سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروش سخن اس کے دوسرے دن پہونچا۔ ..... قصہ دیکھا۔ آپ کی جوہر طبع کی لمعانی، اور نیر فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔ ..... جابجا لاچار لکھا ہے ..... لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے ..... ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا ..... لو۔ بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک اُن کو چپکا بٹھا رکھا۔ اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں۔"

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غیتن کی ہے دعا خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

جناب غالب کے خط کا ایک جملہ تشریح طلب ہے۔ یعنی "اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کیا کہا ہے"۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب میں اہل دہلی کو بہت کچھ ناسزا کہا تھا۔ سروش سخن میں اُس کا بھی جواب دیا گیا:-

فسانۂ عجائب	سروش سخن
"جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے، کسی نے کبھی سنی ہو سنائے۔ لکھی دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہی سے تا سلطنت اکبر ثانی کی مثل مشہور ہے نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی۔ دہلی کی آبادی	اور جو اس قصہ کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے ..... کہاں فسانۂ عجائب کہاں سروش سخن مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہمسری؟ ذرہ کو سہا سے کیا برابری؟

ویرانی تھی ۔۔۔۔۔ یہ لطافت، فصاحت اور بلاغت کبھی نہ تھی۔ نہ اب تک وہاں ہے ۔۔۔۔۔ عیش و نشاط کی طرف (نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی) طبیعت جو آئی تو ایک ایک کنجڑن ادنیٰ اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی۔ محمد شاہ (بادشاہ دہلی) کی گورتھرائی ۔۔۔۔۔۔۔"

جولف و نشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے ۔۔۔۔۔۔

حق تو یہ ہے کہ جو اُردوئے معلّٰی کی زبان نہیں جانتا تذکیر و تانیث نہیں پہچانتا جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے۔ وہ فسانہ کیا لکھے؟ اُردو جن کی زبان انھیں پر یہ طعن! ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو بقول حضرت نسیم دہلوی ؎

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نمونۂ کلام سخن دہلوی اصلاحی حضرت صفیر بلگرامی سے

(۱) کوئی بلا سے چیر کے پہلو نکال لے — یارو! جو دل یہی ہے تو اک روز ہم نہیں

(۲) بہ مجبوری تمھاری ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے ہیں — نہیں کہنے کی جو باتیں ہیں وہ ناچار کہتے ہیں
کیا پامال ٹھوکر سے۔ جلایا جنبشِ لب سے — اُسے رفتار کہتے ہیں۔ اسے گفتار کہتے ہیں
جنوں! یوں تو بہت تنکے پڑے رہتے ہیں صحرا میں — چبھے جو پاؤں میں کانٹا اُسی کو خار کہتے ہیں

سلطان نواب سید تجمل حسین خاں۔ عرف سلطان میرزا۔ خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں۔ رئیس اعظم عظیم آباد یہ صاحب دیوان ہیں۔ مثنوی درد دل بھی ان کی یادگار ہے۔ باب اول در بیان سن میں تفصیل موجود ہے جناب سلطان نے ایک غزل (سکندر دیکھ کر۔ چادر دیکھ کر) صفیر بلگرامی کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ اس غزل میں ایک مصرع لگا کر مقطع کر دیا۔

خود کیا ہے ہم نے سلطاں اپنے قاتل کو پسند — جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

اس مقطع کی داد دینے والے سب مرمٹے۔ باقیات الصالحات میں صرف تین بزرگ اسوقت عظیم آباد کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ سید فضل حق آزاد۔ میر عنایت حسین امداد اور ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارک۔ جس کو سمجھنا ہو کہ سلطان کے مصرع ثانی کو صفیر بلگرامی کے مصرع اول نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، وہ اُن باقیات الصالحات کے پاس جائے اور سمجھے۔

جوش شاہ خلیل الدین احمد عرف شاہ خلیل۔ خلف شاہ محمد اصغر۔ منیر شریف ضلع پٹنہ۔

ان کو خواجہ سخن دہلوی بابو مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی کا شاگرد لکھتے ہیں اور جناب نساخ ان کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ سخن کی روایت میں کلام ہے۔ نساخ کا بیان صحیح ہے کیونکہ نساخ کچھ دنوں کے لئے مونگیر میں تھے۔ اُنکے جانے کے بعد مونگیر ہی میں جناب جوش حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور اپنا فارسی اور اُردو کلام اصلاح کے لئے پیش کیا۔ جناب جوش اپنے ایک مکتوب میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"..... اور ایک بات خیال آئی ہے۔ وہ یہ کہ جوشؔ تخلص بوجہ اس کے کہ بہت لوگوں کے اور اچھے اچھے شعرائے مغربی کے ہو گئے ہیں اب ترک کرنا مدِّ نظر ہو گیا ہے۔ اس لئے رمز اور عقل اولاً و ثانیاً (.....) پسند آئے ہیں۔ کیونکہ آفتاب کے سامنے ذرہ کی تابش کہیں ہو سکتی ہے؟ اگر یہ التماس میری حضور میں پسند آئے تو رمزؔ تخلص تحریر فرمادیں گے (یعنی اُن دیوانوں میں جو اصلاح کے لئے صفیر بلگرامی کے پاس آئے تھے)۔ اور رسید اس کی ارسال فرمادیں گے کہ شبہ نہیں پہونچنے کا نہیں رہے۔ زیادہ تسلیمات۔

فقیر زادہ خلیل الدین احمد منیری۔ خاندان برباد کردہ مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ"

نمونہ کلام ؎ اے ناخدائے کشتیٔ عمرِ روانِ ما — خوش بستۂ زتارِ نفس بادبانِ ما

سایہ کی طرح در پہ تو رہتے ہے پائمال — مانا کہ پاسباں کے برابر نہیں ہوں میں

اصدقی میر جان علی شاگرد مولوی نثار علی وکیل عدالت باقر گنج بانکی پور۔ یہ حضرت شاہ قیام الدین اصدق کے مرید تھے اور اسی رعایت سے اصدقی تخلص کیا۔ خواجہ فخر الدین سخن دہلوی بھی حضرت اصدق کے مرید تھے چنانچہ سرو شِ سخن میں ایک قصیدہ کے دو شعر ہیں ؎

ستونِ کعبۂ اسلام۔ عرشِ اعظم حلم — گل بہشت کمالات۔ خضرِ راہِ صفا

وہ کون حضرت شاہ جہاں قیام اصدق — کہ جس کے زیرِ کفِ پا ہے جنت الماوا

میر جان علی اصدقی وہی ہیں جنھوں نے مرزا دبیر کی رباعی کے ایک مصرعہ پر اعتراض کیا تھا۔ اور صفیر بلگرامی نے سودا کی سند پیش کی تھی۔ اصدقی نے ہار مان لی اور کچھ عرصہ کے بعد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پھر اپنے دو بھانجوں کو شاگردی کے لئے پیش کیا۔ میر رفعت حسین بڑے بھانجے نے کبیرؔ اور میر کفایت حسین چھوٹے بھانجے نے صغیرؔ تخلص پایا۔ نمونۂ کلام اصدقی ؎

بہم رکھتے ہیں دونوں عکس و آئینہ کی کیفیت — رخِ روشن وہاں اُس کا۔ دلِ روشن یہاں اپنا

نہال سید شاہ نہال حسن۔ وطن مولانگر ضلع مونگیر۔ مسکن بخشی محلہ عظیم آباد۔ پہلے یہ حکیم مولانا عبد الحمید صاحب یتاںؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے ۱۲۸۷ھ ہجری میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

آپ تلوار تولتے ہی رہے — نگہ ناز کام کر بھی گئی!

حکیم مولانا عبد الحمید عظیم آبادی کے نام پر قلم واسطی بلگرامی کو رُک جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اُن کا اور اُن کے گھرانہ کا علم و فضل و تقدس داستانِ عظیم آباد کا ایک ضروری باب ہے۔ مختصر یہ کہ خاندانِ صادق پور کا رویہ اسلام کے ساتھ وہی رہا ہے جو مجنوں کا لیلیٰ کے ساتھ تھا یعنی ؎

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہی یہی — دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

چنانچہ مولانا عبدالحمید کے پدر گرامی قدر مولانا احمداللہ صاحب نے ۱۲۸۱ھ ہجری میں آبِ دریائے گنگ کے بدلے آبِ دریائے شور قبول فرمایا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ؎

شرابِ دغا ہم نے پی ہے صفیر — یہ دھبے نہ اب عمر بھر جائیں گے

ہیرے کا ٹکڑا بھی ہیرا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حکیم مولانا عبدالحمید بھی یگانۂ روزگار نہ ہوتے۔ موروثی جائدادیں ضبط ہوگئیں کتب خانہ لٹ گیا۔ گھر تباہ ہوگیا۔ مگر علم و فضل کا دریا خشک نہ ہوا۔ البتہ دریا پہلے صادق پور میں بہتا تھا۔ اب خواجہ کلاں محلہ میں بہنے لگا۔ ذرا اس تلاطم، اور بے بسی، اور خانہ ویرانی، اور شکستہ پائی، اور پریشانی کی حد ملاحظہ ہو کہ مولانا عبدالحمید کا تخلص تک پریشاں ہوگیا ؎

پریشانی ہماری کاکلِ محبوب جانے ہے — پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

چاند چودھویں کا ہو یا پہلی کا۔ یہ بھی چاند۔ وہ بھی چاند۔ مولانا عبدالحمید مرحوم کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (پی۔ ایچ۔ ڈی) آج بھی صدر نشینِ مسندِ علم و فضل ہیں۔ بقول حضرت صفیر بلگرامی ؎

کسی صورت میں اے واعظ نہیں نقصان بڑھتا — کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے

شاد سید علی محمد شاد کی شاگردی کا واقعہ نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا یعنی سلطان عظیم آبادی اپنی تالیف مرقع فیض میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"شاد۔ سید علی محمد خلف مہین جناب میر عباس صاحب مرحوم۔ رئیس حاجی گنج پٹنہ۔ یہ مولف تذکرہ کے بہت بڑے دوست لڑکپن کے ہیں۔ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی۔ سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں جناب سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب ہجرتی نے جب مرزا علی صاحب کے امام باڑہ میں مشاعرہ شروع کیا اُسوقت میر علی محمد صاحب کو شاعری کا شوق شروع ہوا۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ اور شاد تخلص مقرر کیا۔

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے تک رہا۔ اُس کے بعد محرم وغیرہ کے سبب سے موقوف ہوا۔ اُسی مشاعرہ میں حضرت صفیر بلگرامی مدظلہ بھی بہ تحریک جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب انھیں دنوں آرہ میں جاکر حضرت کے شاگرد ہو چکے تھے اور مطیر تخلص پا چکے تھے۔ المختصر جب ۱۲۸۱ھ ہجری شروع ہوا تو بعد اربعین جناب سید حامد حسین صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی میں مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر فرمایا کہ جناب ممدوح بھی انھیں کے مکان میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور دیوان صفیر بلبل چھپ چکا تھا۔ چنانچہ اُس میں ایک تاریخ میر علی محمد صاحب شاد کی بہ شاگردی فریاد موجود ہے۔ غرض دوسرے مشاعرہ کی طرح میں میر علی محمد صاحب شاد بمعیت شاہ حفاظت حسین صاحب چار بجے دن کو میر حامد حسین صاحب نکہت کے مکان میں تشریف لائے۔ اور باستبداد تمام جناب صفیر کے شاگرد ہوئے۔ اور ۱۲۸۷ھ ہجری تک یک قلم برابر تعلیم پائی۔ اور

دور و نزدیک یعنی بذریعۂ خطوط و ملاقات فیض پایا کئے۔ اور عین مشاعرہ میں اصلاح لیا کئے۔ اور شاعر کامل ہو گئے۔
اور پہلے پہل بندۂ سلطان کو بھی انھوں نے آمادہ کیا۔ اور اُن کی شاگردی سے دو چار روز بعد انھیں کے
مکان میں مجھے حضرت صفیر کی شاگردی کا اتفاق ہوا۔"

اس تحریر کو دیکھئے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں رئیس عظیم آباد کے ہاں کی تقریب کو یاد کیجئے۔ اُس تقریب میں دو لڑکوں کا مونڈھے سے کھیلنا یاد کیجئے۔ ایک نوواردکا جناب کو اشعار سنانا یاد کیجئے اس روز س ش۔ ص۔ کا قضا و قدر کے جال میں آنا یاد کیجئے۔ اور پھر نو برس کے بعد س ش اور ص کا ایک ہی ہفتہ کے اندر ص کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہونا دیکھئے۔ بقول حضرت امیر مینائی ؎

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی۔ عرف میرن صاحب کے ہاں مہینہ میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا۔ غزلیں شگوفۂ نکہت میں چھپتی تھیں۔ یہ گلدستہ عظیم المطابع واقع کشمیری کوٹھی عظیم آباد سے نکلتا تھا۔ ۳۰ برس پہلے کا ایک اشتہار ملاحظہ ہو ؎

شہر میں پھر بہار آئی ہے تازہ تازہ شگوفے لائی ہے
یعنی پھر یاں مشاعرہ ٹھہرا خوش زبانی کا پھر مزا ٹھہرا
پندرہ دن یہ جلسہ ہوتا ہے باغ و بستاں کا رنگ کھوتا ہے
بانی جلسہ بامروت ہیں میر حامد حسین نکہت ہیں،
مغتنم ہے بہت عظیم آباد اس کو رکھے مرا کریم آباد
اس طرح جب مشاعرہ ٹھہرا دوستوں کا یہ مشورہ ٹھہرا
ہے مزا جو مشاعرہ چھپ جائے خوش زبانوں کا تذکرہ چھپ جائے
از الف تا بہ یائے تحتانی ایک مجموعہ ہو گا لاثانی
ہو گئی جب ردیف کی ترتیب پھر تو دیوان ہے عجیب و غریب
ڈھنگ شہرت کا یہ نرالا ہے بے تردد کلام چھپتا ہے
—— بے مشقت ہو مشق کی صورت کھل رہا ہے شگوفۂ نکہت ——

اس اشتہار میں ۳۷ شعر ہیں۔ صرف ۱۱ شعر یہاں لکھے گئے۔ یہ وہی یادگار گلدستہ ہے جس سے جناب شاد کی شاگردی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ وہی نکہت عظیم آبادی ہیں جن کے مکان میں جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین مطیر کے ساتھ صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے
اس یادگار مشاعرہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مطیر عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی

پھیلا ہوا جو اُن کی نگاہوں کا جال ہے
اب میرے مرغِ رنگ کو اُڑنا محال ہے
ہم کارزارِ عشق میں ثابت قدم رہے
رستم ہمارے منھ پہ چڑھے کیا مجال ہے
لایا ہے اُن بتوں کے محلے میں مجھ کو دل
مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے
محشر ہوائے مطیر اگر میں برس پڑوں
پھر ارض کی نشست نہ گردوں کی چال ہے

اس زمین میں صفیر بلگرامی کے چند شعر یہ ہیں ؎

تیرا ہمارے دھیان سے جانا محال ہے
تیری مثال نوعِ بشر میں محال ہے
اس سے اُلجھ گئی۔ کبھی اُس سے اُلجھ گئی
ہنسنے میں اُس کے سکڑوں باتیں نکلتی ہیں
نامہ نہیں، پیام نہیں، پوچھنا نہیں
ہوتا ہے مجھکو رنج تو ہوتے ہیں آپ خوش

آہو ہے تو۔ تو کیا ہے؟ چھلاوا ہے تو۔ تو کیا؟
غافل! صفیر پاس کمندِ خیال ہے

شاد عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی

اس شش جہت میں جو ہے اُسے انتقال ہے
حقا کہ تیری ذات صنم بے زوال ہے
جو کام ان کی زلفِ گرہ گیر سے ہوا
صیاد تیرا جال کرے۔ کیا مجال ہے
اللہ رے بہار کہ پھولا ہے لالہ زار
گلشن میں جس درخت کو دیکھو نہال ہے
اے شاد کس طرح سے کروں عرضِ مدعا
ناآشنا ابھی صنم خورد سال ہے

تو اے پری اسیرِ طلسمِ خیال ہے
آئینہ خانہ تیرا جہان مثال ہے
تیغِ نگاہ یار کی کچھ طرفہ چال ہے
موجِ تبسم اُس کی زبانِ سوال ہے
کیونکر کہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے
دیوارِ قہقہہ مری گردِ ملال ہے

جناب شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تو مرثیہ کہنے کا بھی شوق ہوا۔ حضرت علی اکبر علیہ السلام کی شان میں اکاون بند کا ایک مرثیہ کہہ کر شاد نے صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا۔ مرثیہ نامربوط تھا۔ اُستاد نے جابجا قطع و برید کی۔ رفو کیا اور اپنی طرف سے اکتالیس بند کا پیوند لگا کر مرثیہ کو درست کیا۔ یہ بانوے بند کا مرثیہ شاد کا سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور یہ تبرک آج ستر برس سے آرہ میں ہے۔ آرہ میں کیوں ہے اس کی وجہ حضرت صفیر بلگرامی سے سنئے:۔

"..... میں نے اکتالیس بند اور ملا کر، ربط دیکر، بانوے بند کا مرثیہ اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا۔ اور اُس پر اُنھوں نے

(شاد نے) چند رباعیاں پھر اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ اُس پر بھی میں نے اصلاح دی۔ آخر محرم میں معہ اُس مرثیہ کے اُن کو (شاد کو) جناب میرزا دبیر صاحب کے پاس لے گیا۔ جناب محسن صاحب مرحوم (انھیں سید محسن کے پوتے نواب سید نصیر حسین خاں خیال مرحوم ہیں) اُن کے عم نامدار بھی تھے مرزا صاحب کے پاس اُسوقت کوئی پچاس آدمی بیٹھے تھے (ان پچاس آدمیوں میں میر بادشاہ علی بقا لکھنوی خلف میر وزیر علی صبا لکھنوی بھی تھے)۔ جناب محسن صاحب نے فرمایا: میرا بھتیجا ہے۔ اور اس نے مرثیہ کہا ہے۔ حضور کے پاس اصلاح کو لایا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا آپ کس کے شاگرد ہیں۔ جناب شاد نے کہا میر صفیر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اور میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ اُس وقت میرزا صاحب نے دو ایک بندوں پر اصلاح دی۔ اور پھر رکھ لیا آخر دہ مرثیہ مرزا صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ اور دوسرے یا تیسرے برس وہ مرثیہ اصلاح دیکر مرزا صاحب نے لاکر جناب شاد کو دیا۔ انھوں نے مجھے دکھایا۔ میں نے اُن سے لے لیا اور وہ بجنسہ معہ مسودہ جناب شاد اور اُس پر جناب مرزا صاحب کی اصلاح میرے پاس موجود ہے۔"

یہ مسودہ آج انمول ہے۔ اس کو گلِ بکاؤلی بھی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر صفیر بلگرامی کی تحریر۔ میرزا دبیر لکھنوی کی تحریر۔ ان تینوں تحریروں کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے تو اسی مسودہ میں،

اب نمونۂ اصلاح ملاحظہ ہو ؎

اصل بند شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
بند ۴۵ رُخ کے قرین جو ملتی ہے زلفِ سیاہ فام	پہلوئے رخ میں دیکھ کے زلفِ سیاہ فام
غل ہے کہ اک جگہ ہے بہم نورِ صبح و شام	کہتے ہیں سب کہ آج بہم دیکھے صبح و شام
یا شام میں ہے یوسفِ ذیجاہ و احترام	یا چاہ میں ہیں یوسفِ ذیجاہ و احترام
کعبہ میں یا خلیل نے آکر کیا مقام	یا کعبہ میں خلیلِ خدا نے کیا مقام
بہرِ دعا جو عزم شہِ کائنات ہے مشغول سیر ہاں عقب و زرات ہے	عزم دعا میں ابن شہ کائنات ہے مشتاق سیر کی عقب رد زدات ہے
بند ۴۸ ڈوبا ہے وصف چاہِ ذقن میں دلِ حزیں	ڈوبا جو وصفِ چاہِ ذقن میں دلِ نزار
زمزم میں یا کہ ہے مہِ کنعانِ بر ترین!	گوہر کی طرح مل گئے مضمونِ آبدار
کہتا ہے یہ تلاطمِ دریا نہیں۔ نہیں	خالی نہیں ہے آب سے یہ چاہِ زینہار
ظاہر ہے صاف دُرِ نجف کا ہے یہ نگیں	ہے چشمۂ دہن سے یہاں آب برقرار
چاہِ ذقن کے پاس خط مشکبار ہے کوثر کے گرد سبزۂ رنگیں بہار ہے	چاہِ ذقن کے پاس خط مشکبار ہے کوثر کے گرد سبزہ کی دونی بہار ہے

شاگرد کس طرح ٹھوکریں کھاتا ہے اور اُستاد اُس کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو پہلے بند کی ٹیپ کا پہلا مصرع اور دوسرے بند کا دوسرا مصرع دیکھئے۔ یعنی شہِ کائنات اور زمزم میں مہِ کنعان۔ شاہ کائنات کا فرزند شاہ کائنات نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ماہِ کنعاں کو زمزم سے کوئی واسطہ نہیں۔ جائے اُستاد خالی است!

اس مرثیہ کا آخری بند یہ تھا ؎

اے شاد بس۔ کہ طول کا دینا نہیں پسند — پہونچی ہے اب کہاں سے کہاں فکرِ ارجمند
مضموں کے ساتھ ہونگے ترے شعر بلند — مطبوعِ طبعِ اہلِ سخن ہونگے سب یہ بند
شایانِ خود پسندیِ داعزاز تو نہیں
یہ پٹنہ ہے۔ یہ پٹنہ ہے۔ کچھ لکھنؤ نہیں

میرزا دبیر لکھنوی کی مروّت اور بلند نظری نے یہ گوارا نہ کیا کہ عظیم آباد کا پلّہ لکھنؤ کے مقابلہ میں سبک ہو۔ اس لئے بادشاہِ ملکِ معانی نے اصلاح یہ فرمائی ؎

یارب یہ باغِ نظم ترا بے خزاں رہے — اک رنگ پر بصورتِ باغِ جناں رہے

اس پہونچے ہوئے فقیر کی دعا کا اثر دیکھئے کہ آج شاد کی پھلواری میں بہارِ بے خزاں کا دور دورہ ہے!

شاگردی کے زمانہ میں جناب شاد کو کن کن منزلوں سے گزرنا ہوا تھا اس کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئے اس دفتر کا ایک پرزہ یہ ہے:-

کلام شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
(۱) گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کا مدخل ہے	گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کی پھر چل ہے
خدا کے فضل سے کیا ان دنوں آباد جنگل ہے	ذرا دیکھ اے جنوں۔ کیا ان دنوں آباد جنگل ہے
ہماری آنکھ سے، وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے	عجب اندھیر ہے۔ وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے
تو اپنے خانۂ تاریک میں آہوں کی مشعل ہے	مرے تاریک گھر میں نالۂ سوزاں کی مشعل ہے
کہیں سر وجد میں ساکن۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں	کہیں سر وجد میں جنباں۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں
ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے	ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے
دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی	دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
صدف مینا ہے۔ ساغر ساقیا نیساں کا بادل ہے	صدف ساغر ہے۔ مینا ساقیا نیساں کا بادل ہے
(۲) نہ ہوئے عاشقوں میں نام تک اسکا کبھی روشن	نہ ہوتا عاشقوں میں نام تک میرا کبھی روشن

بجھادی شمع تک کافر نے آکر میرے مدفن پر
نزاکت نے نہ یارا قتل کا میرے دیا اُن کو
کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
چمن میں جب تلک ملتے رہے مستی وہ ہونٹھوں میں
میں کیا کیا چٹکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر
(۳) پہلو سے چھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
جنگل سے اے جنوں کوئی وحشی جدا نہ ہو
لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تیرے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو
چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کریں
ہجراں کا کیا گناہ جو میری قضا نہ ہو
نازک ہے دل۔ مزاج کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو
زیبا نہیں ہے رشک دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو
رہنے دو تا بمرگ تصور اُس آنکھ کا
آنکھوں سے میری ساغر و مینا جدا نہ ہو
مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
اے شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو
(۴) گئی ہرگز نہ بوئے میرزا یانہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے
حرارت ہوئے گی جس دم سوا گرمیِ محشر سے
چھپالوں گا میں جسم زار اپنا دامنِ تر سے
جو وہ زلفِ سیاہ فتنہ ساماں رام ہو جائے
تو بھر دوں یا الٰہی طاقِ مسجد مشک و عنبر سے

بجھادی شمع تک کافر نے آکر میرے مدفن پر
نزاکت نے نہ چاہا مجھ کو اُن کے ہاتھ کا کشتہ
کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
وہ جب تک باغ میں ملتے رہے مستی کو دانتوں میں
میں کیا کیا چٹکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر
پہلو سے چھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
نکہت میں اے جنوں کوئی گھر سے جدا نہ ہو
لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تجھ سے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو
چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کریں
وحشت کا کیا گناہ جو اپنی قضا نہ ہو
اپنے دلِ غیور کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو
زیبا نہیں ہے ناز دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ بدن میں قبا نہ ہو

{ "یہ شعر کچھ نہیں"

مانا کہ شعر گوئی سے میری سب کو لطف
کیوں شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو
گئی ہرگز نہ بوئے میرزا یانہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے
حرارت جبکہ بھڑکے گی سوا خورشید محشر سے
چھپالوں گا میں جسم زار اپنا دامنِ تر سے
جو وہ زلفِ سیاہ فتنہ ساماں ہاتھ آجائے
بھروں گا یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے

مثال عاشقِ شیدا جو ہر دم اس کا طالب ہے
ملا کیا لطف اس غم کو ہماری جانِ مضطر سے

براقت میں صفا میں روشنی میں۔ ایک پاتا ہوں
کروں گا استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے

شبِ فرقت جب آئی۔ خونِ دل اپنا پیا آ کر
نہیں مہماں پھرا بھوکا۔ خلیل اللہ کے گھر سے

دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آ آ کے بستر سے

(۵) مخمس بر غزل خواجہ وزیر لکھنوی

کون سی ساعتِ بد تھی جو یہاں آ کے پھنسے
پائے وحشت زدہ بڑھ بڑھ کے مژہ نے چومے

حضرت خضر کچھ آگاہ ہیں ان باتوں سے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے

گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر
حلقۂ گیسوئے پیچیدہ نہیں۔ زنداں ہیں

یہ بھی انسان۔ کرو غور۔ نہیں۔ حیواں ہیں
چھوٹنے کی نہیں صورت۔ تو عجب حیراں ہیں

دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

مزۂ وحشتِ دل دشت میں چکھا ہم نے
اے جنوں رتبۂ عالی ترا دیکھا ہم نے

کر کے صحرا میں گزر۔ لطف اُٹھایا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے

چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر
شادؔ سے پوچھئے کیفیتِ حالِ دلگیر

بسانِ عاشقِ شیدا جو ہر دم گرد ہے اس کے
ملا کیا لطف ہے غم کو ہماری جانِ مضطر سے

صفائی میں جلا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
بجا ہے استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے

شبِ فرقت جب آئی۔ خون دل کا کر دیا حاضر
نہیں مہماں پھرا بھوکا خلیل اللہ کے گھر سے

دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آ کر مرے سر سے

.. ..

جائے رقت ہے۔ اسیری کے محن کیا کہئے
ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ حالِ بدن کیا کہئے

جس کی تحقیق نہ ہو کچھ وہ سخن کیا کہئے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے

گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر
بے وفا! دونوں ہیں گیسو ترے یا زنداں ہیں

ان کے حلقوں میں ہیں دل۔ یا کہ مہ کنعاں ہیں
سالہا سال سے بیچارے بلا گرداں ہیں

دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

جب کیا وادیٔ وحشت کا ارادہ ہم نے
جسم سے رختِ تعلق کو اُتارا ہم نے

جا کے لی سلطنتِ وادی و صحرا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے

چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر
قابلِ رحم ہے اب شادؔ کا حالِ دلگیر

ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے اُلفت کے اسیر
حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو وزیر
زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پر

ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے اُلفت کے اسیر
حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو وزیر
زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پر

ان اصلاحوں کا سلسلہ کامل سات برس تک جاری رہا۔ ۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ تک۔ اس زمانہ میں صفیر بلگرامی کا قیام زیادہ تر عظیم آباد کشمیری کوٹھی میں تھا۔ اس وجہ سے جناب شاد کو فیض حاصل کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ خود حضرت صفیر بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"..... (ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں جو مشاعرہ ہوا تھا اُس میں) جناب میر علی محمد صاحب شاد کا حال معلوم ہوا کہ پانچ چار مہینے سے شعر کہتے ہیں۔ اور جناب شاہ اُلفت حسین صاحب فریاد سے اصلاح لیتے ہیں اتنے میں گزری کا مشاعرہ برخاست ہوا۔ اور اب میری خاطر سے کشمیری کوٹھی میں جناب نکہت کی طرف سے ہونے لگا.... اُسی مشاعرہ کی دوسری طرح میں (زمین لال ہے خیال ہے).... غزل کہہ کر جناب شاد میرے پاس اصلاح کیلئے لائے۔ اور شاگرد ہونے آئے ..... میں تو جانتا تھا کہ وہ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد کے شاگرد ہیں مجھ کو تامل ہوا۔ اور استفسار کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا وہ کلکتہ جاتے ہیں اور میں آپ کے سوا کسی دوسرے کو قابل اصلاح دینے کے نہیں پاتا..... آخر میں نے بعد اصرار کے قبول کیا اور چند رئیسانِ کشمیری کوٹھی کے سامنے اُن کی غزل پر اصلاح دی اور ہر اصلاح پر وجہ اصلاح کی بھی لکھ دی۔ اُس دن سے جناب شاد اصلاح لینے لگے۔ اور میں بھی روزانہ چار گھڑی دن رہتے حاجی گنج جاتا اور نو دس بجے شب کو سواری پر وہاں سے آتا۔ اور یہی حال برسوں رہا۔ اس مدت میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور جناب شاد کو شوق بڑھتا گیا اور میں نے بھی اپنی کم مائگی پر جو کچھ جانتا تھا بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ اور اُن کی طبیعت کو اہل پٹی تھی اُس کو طریقہ بتا بتا کر بلند کر دیا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے خاندان کی وضع پر لایا....."

اس بیان کی تصدیق خود جناب شاد کا قلم اس طرح کرتا ہے ؎

مخمس ۱ ؎

دروغ گو نہیں کچھ شاد جو زباں پھیرے — جہاں میں کہنے کو شاعر ہیں یوں تو بہتیرے
جو مجھ سے پوچھ تو یہ ہے گمان میں میرے — صفیر لطف ہے ملتا کلام میں تیرے
زبان خوب ہے تیری۔ بیاں بہت اچھا

مخمس ۲ ؎

کر لیا ہے شاد کو زلفِ مضامیں نے اسیر — فی الحقیقت آپ اس فن میں نہیں رکھتے نظیر
اب نئی طرحوں میں پڑھئے شعرہائے دلپذیر — یہ زمیں تفریح کی تھی۔ بس کریں آپ اے صفیر
ہو چکے اس میں بہت اشعار۔ رہنے دیجئے

زبانۂ شاگردی میں جناب شاد نے اپنے اُستاد صفیر بلگرامی کو جو خطوط بھیجے اُن میں سے چند یہ ہیں :۔

مکتوب اوّل بلبلِ شاخسار حدیقہ جادو بیانی جناب اوستادی میر فرزند احمد صاحب مدظلہ العالی۔ بعد تسلیم عرضہ یہ ساست بخیریت بودہ صحت وری مزاج اقدس می خواہد۔ از چندے احوال صحت وری معلوم ندارم۔ خداوند کریم ذات عالی را از جمیع بلیّات محفوظ دارد۔ بمنہ وکرمہ۔

دریں مشاعرہ سوائے بندہ وشاہ حفاظت حسین صاحب وسید کاظم حسین صاحب کسے نبود۔ جناب خود تشریف نداشتند تا بدیگراں چہ رسد؟ بنائے جلسہ را لاحاصل دانستہ موقوف ساختم۔ وباوجود وعدہ جناب میر حامد حسین صاحب نیز تشریف نیاوردند۔ برائے تفریح طبع دریں روزہا میخواہم کہ بخدمت شریف حاضر شوم۔ اطلاعاً عرض ساخت۔ زیادہ حد ادب۔

کمترین علی محمد عفی عنہ

مکتوب دوم بلبلیکہ صفیر منقار گہربارش لب طوطیانِ ہند ببندد۔ دام ظلہ۔ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد عفی عنہ تسلیم ونیازمی رساند۔ روزیکہ جناب والا رونق افروز خانہ ام بودند بسبب تذکرہ دوچہار بند مختلف از مراثی جناب مرزا دبیر صاحب خواندہ بودند۔ پس منجملہ آں اگر کدامی مرثیہ ایں جا باشد بعنایتش ممنون تواں فرمود۔ والا دوچار بند کہ یاد باشد نوشتہ عنایت فرمایند۔ بخدمت جناب میر حامد حسین صاحب نکہت سلام می رسانم۔ فقط

علی محمد شاد

مکتوب سوم ہادی بحر گروہ معرکہ آرایان سخن اوستادی۔ شبستانِ فصاحت را شمع انجمن دام عنایتہ۔ شاد چوں دلِ خود در اضطراب ہدیہ سلام وتحیات تسلیمات رسانیدہ عرضہ دہ اینکہ عرصہ ہوا کہ آپ کی خیریت سے آگاہ نہیں ہر سیل عنایت نامہ ضرور ہے کہ اس سے باعث زور وقوت شاگرد نیازمند متصور ہے۔

ان دنوں عجب واقعہ، طرفہ ماجرا، برپا ہے۔ ہرچند پہلے مولوی محمد احسن صاحب شاعر گرد میر محبوب شیر شاگرد اُن کے ہم سے مباحثہ میں الزام اُٹھا چکے ہیں، اب پھر وہی تقریب پیش آئی۔ ایک آشنا کے مکان پر بندہ گیا تھا۔ وہاں ایک سادی کتاب رکھی تھی۔ اُس میں کچھ اشعار مولوی صاحب کے لکھے تھے۔ اور ایک رنڈی ہر مسمی جُبّا۔ ردیف غزل اُسی کے نام سے تھی۔ بندہ نے وہیں ایک غزل اُسی قافیہ ردیف میں کہہ کے لکھ دی۔ جب مولوی صاحب کے ملاحظہ میں آئی تب اُنھوں نے ایک مطلع اور دو شعر اُس کتاب میں لکھ کر جو عبارت کہ ہم آگے لکھیں گے لکھ دی۔ جب بندہ نے وہ دیکھا خدا کے فضل سے وہیں جواب اُس کا لکھا اور پھر مولوی صاحب نے اُس کو دیکھ کے جواب لکھا۔ بندہ نے پھر اُس کا جواب لکھا۔ جب سے پھر اُس کا جواب مرحمت نہ ہوا۔ اس شہر میں ایک دھوم ہوئی کہ جناب شاعر گرد صاحب سپر انداختہ ہوئے اور الزام کھایا۔

چونکہ اطلاع اس کی آپ کی جناب میں حقیر کو ضرور تھی اس واسطے التماس کیا۔ فقط کمترین علی محمد شاد

مکرر آنکہ جو کچھ امان علی خاں صاحب پدرِ یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ۔

نقل عبارت مولوی صاحب

"جس شخص کو دعویٰ شاعری ہو، اس میں شعر کہے، تب حقیقتِ امر کھلے۔

ببیں کہ دارم بسوزِ عشقت جگر میں داغوں کا ایک گلشن
مَتاعِ رُوحی فِداکَ اُنظُر تنک پیارے ہمار کلپن ۵۱

ثنائے حسنت چہ بر نگارد تمہارے غمزوں کا کشتہ احسن
تَخَجَّلِ الشَّمسُ وَالکَواکِبُ تمہارے مکھ کی دمک سے سرجن ۵۲

اور یہ مطلع ہے کہ جس پر ہم کو دعویٰ ہے کہ ورائے قافیہ جبا و قبا کوئی نہیں کہہ سکتا۔

کل جو ہم نے طرفِ سینۂ جبا دیکھا صفحۂ حسن میں بس نور کا قبا دیکھا

راقم محمد احسن عفی عنہ

الجواب :۔ تیغ آبدار زبان سوال اول کے جواب میں رطب اللسان ہے ؎

بگو دلا۔ چیست حالتِ تو بتا تو اے عقل و دیں کے دشمن
فَجَاءَ من فی الخَیَالِ الآن جو بیٹھا بیٹھا کرے ہے سن سن ۵۳

چناں ز وحشت بتنگ گشتم کہ روز کرتا ہوں چاک دامن
فَکُنتُ کَالقَیسِ یا حَبِیبی پڑے جو بپتا تو لاج کیسن ۵۴

وصالِ تو بہرِ دردِ فرقت دوا ہے اے حورِ عیسوی فن
لِعِلَّتی لَاشِفَاءَ قَط لگاؤ ہو ماتھ پر جو چندن ۵۵

---

۵۱ برہ کی سلگن سے جگر داغ داغ ہے۔ داغوں کی پھلواڑی ہے۔ اے پیارے! ہماری جان تجھ پر فدا ہو! اس تڑپن کو ایک نظر دیکھ تو لے!

۵۲ تیری اداؤں کا ماڑا حسن تیرے حُسن کی تعریف کرے تو کیا کرے ؟ ۔ جب تیرے مکھڑے کی دمک سے سورج اور سورج بنسی تک شرمائے جا رہے ہیں۔

۵۳ اے دل! اے عقل اور دین کے دشمن! تیرا حال کیا ہے ؟ ۔ تجھ کو اسوقت کس کی یاد آگئی جو تو بیٹھا ہوا یوں سن سن کر رہا ہے ؟

۵۴ وحشت کا اب یہ زور ہے کہ دامن ہر روز پھٹتا ہی رہتا ہے۔ اے لیلیٰ! تیرا دیوانہ کہتا ہے کہ بپت کا مارا لاج کرے تو کہاں تک کرے ؟

۵۵ جدائی کا درد وصل سے جاتا ہے۔ ماتھے پر چندن لگانے سے نہیں جاتا ۔ بیدجی مہاراج! اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا روگی اچھا ہو تو کیونکر ہو ؟

شدہ است عالم چناں زو وحشت — کہ ہوئے جس کے بیاں سے اُلجھن } ۱ھ
فَفِیْ فِرَاقِ الْحَبِیْبِ سِرْتُ — اتیت جیسے پھرے ہے بن بن }

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے — تمہاری آفت کی چشم پُرفن } ۲ھ
یَکُوْنُ سَیْفًا لِقَلْبِ مَحْزُوْنٍ — گجب کریں ہیں تہار چتون }

شدہ است تاریک و تیرہ حد — مری نظر میں جہانِ روشن } ۳ھ
رَاَیْتُ فِی اللَّیْلِ یَا اِلٰہی، — یہ ہم نے سپنے میں کہہ کا درسن }

دلم شکستہ چو جام شیشہ، — خبر ہے او عاشقوں کے دشمن } ۴ھ
مِنَ الْجَارِ الْفِرَاقِ اُنْظُر — یہ تم نے پھوڑیو ہمار باسن }

گہے چو آمد بزیر پایش — زاتفاقات میرا مدفن } ۵ھ
فَقَالَ مِنَ الرَّحِیْمِ قُمْ بِاِذْنِیْ — موئے ہو تم شاد کہہ کے کارن }

اب جواب سوال ثانی کا بیان ہے۔ بہت عجب ہے۔ اور مقام فکر و تعب کہ کس دانائے بے بدل، اور کس جادو نگار شیوا زبان نے یہ مطلع، مثل مطلع خورشید، آسمانِ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے، اور کس ناظم دور اندیش، انشا کیش نے اس عبارت کو لکھ دیا ہے۔ اول مشبہ بہ واحد کا اُس مقام پر استعمال ضرور ہے۔ اور اگر مشبہ جمع ہے تو مشبہ بہ جمع لانا ایسے مقام پر دستور ہے۔ لیکن یہ مطلع عاشقانِ بے سر و پا کی طرح، دونوں سے مہجور ہے۔ اگر یہ مطلع پھر درست کر کے لکھیں تو ہم اس پر توجہ کریں۔

اور ایک دو قافئے نادر اگر تلاش سے ہاتھ آئیں تو باعث فخر و مباہات نہیں۔ اکثر کم گو بھی نکال لیتے ہیں۔ کچھ بات نہیں یہ امر اتفاقیہ دلیل شاعری نہیں۔ برہانِ ماہری نہیں۔ وہ بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ کیونکہ لفظ جبا ساتھ الف مقصورہ کے علم ہے۔ اور قبا ہائی مختفی کے ساتھ ضم ہے۔ ہر چند صحت قافیہ آشکارا ہے۔ پر طبع رسا کو کب گوارا ہے ؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

۱ھ جنوں کا اب یہ عالم ہے کہ اس کے بیان تک سے اُلجھن ہوتی ہے۔ جس طرح بیراگی بن بن مارا پھرتا ہے اسی طرح اپنے پیارے کی جدائی میں ہم بھی کہیں چین نہیں

۲ھ اے پیارے! تجھ کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ تیری جادو بھری آنکھ کیسی تہر ہے اس بیچارے دل کو دیکھ اور اپنی تلوار کو دیکھ۔ اللہ رے تیری چتونوں کا غضب۔

۳ھ اے اللہ! یہ ہم نے رات سپنے میں کس کا درشن کیا ہے کہ اسوقت دن دوپہر ہے مگر آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے!

۴ھ اے چاہنے والوں کے دشمن! تو نے تو ہمارا باسن ہی پھوڑ دیا۔ دیکھ لے کہ جدائی کے پتھر سے دل کا شیشہ چور چور ہے یا نہیں!

۵ھ ایک دن اتفاقیہ اُس کے پاؤں کے نیچے ہمارا مدفن آگیا تو رحم اُس کو آ ہی گیا۔ کہنے لگا کہ "قم باذنی!" اب اُٹھ جا۔ اور ہاں اے شاد تو نے کس کے کارن اپنی جان گنوائی ہے؟

پردے میں گفتگو کب خوب ہے۔ اپنے نزدیک معیوب ہے۔ گیسوئے مشکبار سخن کو طول ہو۔ کسی صحبت میں
اس کا چرچا معقول ہو ؎ ہمچو مرداں سرِ میداں آیند درپسِ پردہ زباں نکشایند
مطلع کا جواب پائیں۔ کچھ حظ اٹھائیں۔

کتبہ خادم الشعرا سید علی محمد شاد عفی عنہ

مکرر یہ کہ ایک غزل بندہ نے کہی ہے۔ طالب جواب ہے ؎

یاد آئی کیوں اسیری میں ترے بالے کی گونج — توڑتی ہے سقفِ زنداں کو مرے نالے کی گونج
میکدہ میں قلقلِ مینا سے شورِ صور ہے — حشر برپا کر رہی ہے آج متوالے کی گونج
ابتدائے حسن میں کب تھی تمھیں اتنی تمیز — یاد ہے۔ کہتے تھے اکثر کھولدو بالے کی گونج
دسترس ہو کاش ہم کو بھی کبھی اے آسماں! — وصل میں وہ ہم سے کھلوایا کریں بالے کی گونج
زلفِ جاناں کے تصور میں جو روئے دشت میں — میرے نالوں سے کہیں دب دب گئی بالے کی گونج

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے بالے کی گونج

جواب از طرف محمد احسن :۔

یہ چند سطریں کسی کی لکھی ہوئی نظر سے گزریں۔ کیفیت استعداد کاتب ہویدا ہے۔ اگر سوال قابلِ جواب ہوتا دیا جاتا۔ قابلِ خطاب نہ جان کر احتراز کیا۔ مگر باصرار عنایت فرمائے حاضر الوقت دو تین بیت بجواب ہر دو ایراد معترض لکھ دئے جاتے ہیں۔

فردوسی :۔ چو بکشاد آں طرۂ مشکناب — شب آمد بپا بوسئ آفتاب
مولانا جامی علیہ الرحمہ :۔ چو فرق آراست آں پاکیزہ گوہر — کشیدہ بر محک گویا خطِ زر
قلق :۔ سامنا سلطانِ عالم سے ہمارا ہو گیا — پرتو خورشید سے ذرہ ستارا ہو گیا

العاقل تکفیہ الاشارہ۔ اگر خرد است ہمیں قدر بس است۔

محمد احسن

جواب الجواب :۔ یا قومِ انی لکم من الناصحین۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ کاتب کا لکھا دیکھا۔ یہ جو تحریر ہے کہ سوال قابلِ جواب نہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔ اور جو اشعار اساتذہ نے لکھے ہیں وہی ہے کہ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا — الا یا ایہا الساقی اور کاسًا و ناولہا

وہ اشعار جواب نہیں۔ جواب دہندہ کامیاب نہیں۔ جو اصل قاعدہ ہے وہی مطلع میں رہ گیا ہے۔ اس میں جائے گفتگو کیا ہے۔ مگر عارفوں کی بول چال ہے۔ اس کا سمجھنا محال ہے۔ فقط

عبد المذنب سید علی محمد شاد

نقل لفافہ مہری ڈاکخانہ پٹنہ و آرہ۔

بعونہ تعالیٰ بقصبہ آرہ ضلع شاہ آباد۔ بہ پھاٹک صاحبانِ بلگرام بعالی ملاحظہ

بلبل شاخسار خوش بیانی جناب اوستادی سید فرزند احمد صاحب قبلہ المتخلص بصفیر دام ظلہ،

مشرف باد۔ از عظیم آباد۔ علی محمد شاد۔ بیرنگ

جناب شاد کا اپنے اُستاد صفیر بلگرامی کے نام یہ بیرنگ خط پڑھئے اور پھر نواب سید محمد خاں رند لکھنوی کا یہ مقطع پڑھئے ؎

چل کے اب عرض کر دو حضرت آتش سے رند معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

جناب شاد کے اس پر لطف خط میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں:۔

(۱) عظیم آباد میں ایک مرتبہ ڈھول پٹ گیا کہ صفی پور ضلع ہردوئی سے ایک اُستاد ایسا آیا ہوا ہے جو آٹھ دن میں شاگرد کو خاقانی اور سعدی اور فردوسی بنا دیتا ہے۔ یہ غوغا ہوا تو پچھم سے پورب سے دکھن سے اُتر سے جو آتا ہے وہ سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے مکان کا پتہ پوچھتا ہے کیونکہ یہ عجیب و غریب اُستاد اُسی مکان میں جلوہ فرما تھا۔ اس جادو گھر میں ایک نو مشق بھی جاتا ہے تو دو دن کے بعد حافظ اور جامی کے لباس میں نکلتا تھا۔ سید محبوب شیر اور دیگر شاگردوں سے پوچھا گیا کہ آخر معمہ کیا ہے تو جواب ملا کہ اُستاد کا حکم ہے کہ یہ راز فاش نہ ہو۔ تب ایک جاسوس بھیجا گیا یعنی عبدالحکیم تمکین قنوجی۔ اس جاسوس نے شاگردی اختیار کی اور دو دن کے بعد راز فاش کیا کہ ــــ اُستاد کے پاس دو کتابیں ہیں۔ ایک میں مترادف الفاظ ہیں۔ دوسری میں مترادف فقرات۔ جس شاعر کی غزل کے موافق کہنا ہو وہ کتاب سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ الفاظ کی تبدیلی کر کے مصرع موزوں ہو جاتا ہے۔ پہلے تو کتاب رکھنے کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر مبتدی اُس کے الفاظ و فقرات مترادف کو یاد کر لیتا ہے۔ اور غزل پر غزل کہہ دیتا ہے۔

یہ اُستاد وہی اُستاد ہے جس کو جناب شاد نے اس خط میں مولوی محمد احسن شاعر گر لکھا ہے۔ شاعر گر سے مراد یہی واقعات ہیں۔ اور عجب اتفاق کہ تمکین قنوجی جنھوں نے احسن کا راز فاش کیا۔ اور شاد عظیم آبادی جنھوں نے احسن کو شکست دی، دونوں صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ احسن کو بدگمانی ہوئی کہ پسِ پردہ صفیر بلگرامی ہیں۔ حالانکہ جناب شاد کا یہ خط شاہد ہے۔ کہ عظیم آباد میں جس وقت یہ معرکہ ہو رہا تھا صفیر بلگرامی اسوقت آرہ میں تھے۔

احسن کا قیام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے ہاں تین چار برس رہا۔ مگر تمکین و شاد کا بخار انھوں نے صفیر بلگرامی سے نکالا۔ اور باوجود ہموطنی کے (صفی پور موضع بلگرام کے پاس ہے) ان سے ملاقات نہ کی۔ صفیر بلگرامی نے ایک مرتبہ رقعہ لکھ بھیجا، جس میں کسی کا یہ شعر بھی تھا ؎

تعجب کی جگہ ہے۔ ہم تم اک بستی میں بستے ہیں اور اُس پر یہ مزا ہے۔ دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

اس کا جواب احسن نے دیا کہ جو مشتاق ہو وہ خود آئے۔ الغرض احسن تین چار برس رہ کر اور سید محبوب شیر صولت کو صاحب دیوان بنا کر غازی پور چلے گئے، وہاں محمد تقی کوکب جونپوری، حکیم محمد اسحاق حاذق لکھنوی وغیرہ احسن کے

شاگرد ہوئے۔ اب عظیم آباد کا واقعہ سنئے کہ سید محبوب شیر نے اپنا دیوان میر قاسم شیر کے ہاتھ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا۔ اور تقریظ لکھنے کی استدعا کی۔ مولانا حسرت نے یہ لکھ کر ٹال دیا:۔

"وصف کلام فصاحت التیام سامی کہ مالامال نازک خیالی ہاست چہ گویم کہ می ترسم کہ تحسین ناشناس موجب شکست قدر آں گوہر شاہوار نگردد۔"

یعنی آپ کے کلام کی تعریف ہم کریں تو کیونکر کریں؟ ڈر یہ ہے کہ تحسین ناشناس اُس کو بے قدر کر دے گی۔ تقریظ آپ کسی سخن شناس سے لکھوائیے۔ بہرکیف سید محبوب شیر نے ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی۔ چار برس کے بعد مرحوم کے خلف سید علی شیر مکنت نے یہ دیوان چشمۂ علم پٹنہ میں طبع کرایا۔

آج نہ احسن ہیں۔ نہ سید محبوب شیر ہیں۔ نہ شاد عظیم آبادی ہیں۔ مگر اُس ہنگامہ کی یاد شاد کے مقطع سے آج تک تازہ ہے ؎

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

مصرع اول میں "محبوب" کا اشارہ جناب احسن کے محبوب یعنی سید محبوب شیر کی طرف ہے۔

(۲) جس زمانہ میں احسن کا دور دورہ تھا اُس زمانہ میں زلیخائے مصری کی دو بہنیں نجّا اور جبّا سارے عظیم آباد کو چالے ہوئے تھیں۔ نجّا کی نشانی باندی۔ باندی کی نشانی سعیدہ۔ مگر جبّا کی نشانی پوچھئے تو شاد و احسن کا یہی معرکہ ہے ؎

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے تمہاری آفت کی چشم پُرفن
یکُوُنُ سَیفًا لِقَلبِ مَحزُوُنٍ گجب کریں ہیں تہارچتون

شاد نے جن آنکھوں کی دوہائی دی ہے وہ آنکھیں ایک باکمال عورت کی تھیں۔ جبّا کی فارسی دانی اور ادبی قابلیت سے لوگوں کا ناطقہ بند تھا۔ ایک مرتبہ کشمیری کوٹھی میں مخصوص فارسی قصاید کے لئے مشاعرہ تھا۔ فارسی گو اساتذہ کا مجمع تھا اور صدر میں جبّا تھی۔ شعرا اپنے اپنے قصائد سنا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ممتاز رئیس و ادیب نے اپنا قصیدہ شروع کیا تو جبّا بول اُٹھی:۔

"میں اس کا قصیدہ سن کے کیا کروں گی؟"

رئیس و ادیب بیچارہ پانی پانی ہوگیا۔ مجمع انگشت بدنداں تھا۔ مگر جبّا کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا۔

(۳) جناب شاد کے اس خط میں ایک جملہ ہے:۔ "جو کچھ امان علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ" اس سے مراد مرزا قتیل کے شاگرد مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اُردو میں قصہ امیر حمزہ انھیں کی تالیف ہے۔ ان کا قیام دیوان محلہ عظیم آباد میں تھا۔ غالب لکھنوی کے بیٹے مرزا نوروز علی خاں یکتا عظیم آبادی

وہی ہیں جن کی یکتائی عبدالغفور خاں نساخ کو نہ بھائی۔ نساخ کا نشتر ملاحظہ ہو:۔

"ان میں (یکتا میں) ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں"

مگر ناظر وزیر علی عبرتی کا ایسا مستند ادیب و چشم دید گواہ کہتا ہے:۔

"چشم بد دور تلاشے دارد رنگین تراز دہنِ گل۔ وفکرے دارد آتشیں تراز نغمۂ بلبل۔۔۔ نظم آبدار می نگارد۔ ونثر ثریا نثاری طراز د۔ ایزد تعالیٰ نہالِ خیالش را ہمہ بہار دارا د۔۔۔۔۔"

(باقی) **وصی احمد بلگرامی۔ بی۔ اے**

جاپان مصنفہ چمن لال صاحب، مترجمہ محمود علی خاں صاحب (جامعی) آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے بالکل گمنامی میں پڑا تھا۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ (امریکہ) کی رائے ہے کہ "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں ہے کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پر از معلومات تصنیف ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس خوبی سے اس کے صفحات میں تازہ ترین اور دلچسپ معلومات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ قابل مصنف نے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے کتاب لکھتے وقت ہندوستان کو پیشِ نظر رکھا ہے"۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات، بلاک کی ۳۰ تصاویر مجلد عہ ر۔ غیر مجلد ۱۱ تصاویر عہ

نفرت کا بیج (ڈراما) از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ زندگی میں اس سے زیادہ کوئی چیز تلخی پیدا نہیں کر سکتی کہ دوست ناراض ہو کر دشمن بن جائیں یا اپنی خود غرضیوں پر دوستی کو قربان کریں لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ کوئی چیز عام بھی نہیں ہے ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ خود غرضیاں جو دوستی کو بد دلی میں تبدیل کر دیتی ہیں صرف تعلقات میں جنگی تک پہونچ جائیں لیکن کبھی کبھی ان کی حد سخت نفرت تک پہونچ جاتی ہے وہ لوگ جو اپنے دل میں محبت، کی جگہ نفرت کا بیج بوتے ہیں اس تمثیل کو ذرا غور سے پڑھیں۔ قیمت ۸ر

شعلۂ طور از جگر مرادآبادی۔ سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری، جو فارسی میں امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صنعت ہے اردو میں جگر مرادآبادی کے حصہ میں آئی ہے، شعلۂ طور جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے، کاغذ، طباعت، کتابت اعلیٰ۔ سرورق خوشنما رنگین جلد نفیس قیمت صرف تین روپے۔

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

مشرقِ بعید کے زرد خطرہ کی داستان

اور

جاپانِ جدید

مسلسل

کوریا کی اہمیت جاپان کے سیاسی فروغ کا آغاز ۱۸۹۴-۹۵ء سے ہوتا ہے جب اُس نے چین پر مکمل فتح حاصل کرلی۔ جھگڑے کی بنیاد وہ پہاڑی جزیرہ نما تھا جو منچوریا سے لیکر ساحلِ جاپان کے سو میل اندر تک پھیلا ہوا ہے اور جس کو کوریا کہتے ہیں۔ یہ مقام اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے تجارتی، سیاسی اور عسکری مفاد کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس علاقہ کی حکومت نہایت فرسودہ اور خام بنیاد پر قایم تھی اور اس وجہ سے ہر زبردست قوم اُس پر قابض ہوسکتی تھی۔ جاپان کا طرزِ عمل کوریا کے ساتھ کچھ تو مدافعانہ تھا اور کچھ جارحانہ۔ ایک طرف تو اُسے خطرہ تھا کہ روس اس علاقہ کو اپنے قبضہ میں نہ کرلے اور دوسری طرف وہ خود چاہتا تھا کہ کوریا کو اپنا ماتحت ملک بنا کر وہ ٹین سین اور پیکنگ کی طرف جانے والے بحری راستہ کو اپنی تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرے۔

چین بھی ایک عرصہ سے کوریا پر ایک موہوم سے اقتدار کا دعویٰ کرتا تھا۔ لیکن بہت جلد اُس نے جاپان کے زور دینے پر ایک معاہدہ کرلیا جس کی رو سے جوزن کی (جو کوریا کا پُرانا نام تھا) آزادی تسلیم کرلی گئی۔ اُس وقت سے جاپان کا یہ مقصود رہا ہے کہ وہ اُمراء کی ذی اثر پارٹی کے ذریعہ سے کوریا کے دارالخلافہ سیول پر اپنا اقتدار جمائے رکھے۔ اس کے مقابلہ پر چین نے بھی اپنا ایک نمایندہ جاپان میں مقرر کردیا جو حکومتِ چین کو حالات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ بعد میں اس نمایندہ نے کوریا کی حکومت میں اس قدر اثر و رسوخ پیدا کرلیا کہ وہ چینی اصلاحات بھی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد چینیوں کو کئی قسم کے ٹھیکے دئے گئے جن میں سے محکمۂ تار کا اجارہ سب سے اہم تھا۔

۱۸۹۴ء میں روس نے ٹرانس سائبیرین ریلوے بنانی شروع کی جس کی وجہ سے کوریا کی حالت نازک ہوگئی

اور جاپان و چین دونوں کو خطرہ لاحق ہوا لیکن اسی عرصہ میں کوریا میں ایک بغاوت ہوئی جو کچھ تو مذہبی تھی اور کچھ نراعتی حکومت کوریا نے چین سے امداد طلب کی جس نے اپنی فوجیں فوراً بھیجدیں۔ جاپان نے ایک تجویز پیش کی کہ کوریا کے حالات کی اصلاح چین اور جاپان کی حکومتیں مل کر کریں لیکن چین نے صاف انکار کر دیا جسکی وجہ سے یکم اگست ۱۸۹۴ء کو باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔

چین اور جاپان کی جنگ ۱۸۹۴ء

چین کی فوجیں اور سامانِ جنگ اگرچہ اچھا تھا لیکن اندرونی بدنظمی کی وجہ سے جاپان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور آسن اور پنگ ینگ کی جنگوں کے بعد چین کو کوریا چھوڑنا پڑا۔ ان کامیابیوں سے جاپان کو جرأت ہوئی اور وہ منچوریا تک جا پہونچا۔ جہاں اُس نے بندرگاہ آرتھر کے قلعہ پر بمباری کی اور اُس کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے بعد وہ چین کے دارالخلافہ پیکنگ کے قریب جا پہونچا اور چین نے مجبور ہو کر صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

جب سے جنگ شروع ہوئی چین نے پے در پے دیگر حکومتوں کو امداد کے لئے لکھا جس پر اُن سب نے مداخلت کے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ برطانیہ عظمیٰ کو خطرہ تھا کہ چین میں اُس کے وسیع تجارتی مفاد کو نقصان پہونچے گا اس لئے اُس نے امریکہ، جرمنی، فرانس اور روس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جرمنی اور امریکہ نے اگرچہ امداد کرنے سے انکار کر دیا لیکن دوسری طرف جاپان کو تنبہ کیا کہ وہ معتدل شرائط پر بہت جلد صلح کر لے۔ جاپان نے خفیہ طور پر روس اور برطانیہ کو یقین دلایا کہ وہ کوریا کو اپنے قبضہ میں نہیں کرے گا۔ اس لئے جب چین کا نمایندہ صلح کرنے کے لئے پہونچا تو جاپان نے نہایت سخت شرائط پیش کیں۔ بالآخر اپریل ۱۸۹۵ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے چین نے کوریا کی خود مختاری تسلیم کر لی اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کبھی اُس پر اپنا حق نہیں جتائے گا۔ نیز اُس نے جنوبی منچوریا کا کچھ حصہ اور "لیاؤ ٹنگ" کا جزیرہ نما جس پر آرتھر کی بندرگاہ واقع ہے جاپان کو دیدیا۔

اس صلح کے بعد برطانیہ عظمیٰ کی رائے تو تبدیل ہو گئی کیونکہ اُسے یقین ہو گیا کہ جاپان کی نیت چین کے اندرونی حصہ کے متعلق کچھ خراب نہیں ہے لیکن جرمن گورنمنٹ کو خطرہ ہو گیا کہ اگر روس، فرانس اور برطانیہ آپس میں مل گئے اور اُنھوں نے چین کے حصے بخرے کر لئے تو مشرقِ اقصیٰ میں جرمنی کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ایف۔ سی۔ جونس مصنفِ کتاب "جاپان" کے الفاظ میں جرمن شہنشاہ کے پرسکون دماغ پر "زرد خطرہ" کا ہوا اس قدر سختی کے ساتھ مسلط ہوا کہ وہ روس کے پاس یہ التجا لیکر پہونچا کہ جاپان کے مطالبات ذرا ہلکے کر دئے جائیں۔ روس کے ساتھ فرانس بھی مل گیا اور تینوں حکومتوں نے جاپان پر زور دینا شروع کیا جس کے نتیجہ میں اُس نے جنوبی منچوریا کا وہ حصہ جو اُس نے چین سے لیا تھا واپس کر دیا اور اُس کے بدلے میں کچھ تاوان اور لے لیا۔

روس کے دندان آز

اُس زمانہ میں روس کا وزیر خارجہ کاؤنٹ وٹے (Count Witte) تھا جو آہستہ آہستہ اسکیم بنا رہا تھا کہ تمام شمالی چین کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے۔ وہ اس بارہ میں کوئی سریع الاثر کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے کوئی معقول علاقہ ہاتھ نہ آئیگا ۱۸۹۶ء میں جب چین کا نمایندہ "لی ہنگ چنگ" زار نکولس دوم کی رسمِ تاجپوشی میں شریک ہونے کے لئے روس گیا، تو کاؤنٹ وٹے نے اُس کو ایک خفیہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس خفیہ معاہدہ کی رو سے قرار پایا کہ اگر جاپان دونوں میں سے کسی کے علاقہ پر حملہ کرنا چاہے تو وہ مل کر اُس کا مقابلہ کریں گے اور صلح کے لئے ایسی شرائط پیش کریں گے جو دونوں کے موافق ہوں اسی کے ساتھ یہ بھی قرار پایا کہ روس کو منچوریا میں ریلوے لیجانے کا حق حاصل ہوگا۔ چنانچہ اُسی سال ستمبر میں چین اور روس کے معاہدۂ ریلوے کے متعلق اعلان کر دیا گیا اور قرار پایا کہ چھتیس سال کے بعد چین اس ریلوے کو خرید سکتا ہے یا اسی برس کے بعد اُس کو مفت حاصل کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ موخر الذکر وعدہ کا پورا ہونا محال تھا۔ اس ریلوے کو مشرقی چینی ریلوے کہتے ہیں جو اب تک جھگڑے کی بنیاد بنی ہوئی ہے اور جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

زارِ روس کی جوعِ الارضی اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ مشرقِ بعید کی تمام زمینوں پر قبضہ جما لیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں باوجود کاؤنٹ وٹے کی پیہم منت و زاری کے اُس نے وزیرِ حرب جنرل کوروپاٹکن (Kuropatkin) کی باتوں میں آکر جزیرہ نما لیوتنگ کو پچیس سال کے لئے ٹھیکہ پر لے لیا اور اُس میں پورٹ آرتھر تک مشرقی چینی ریلوے کی ایک شاخ بنائی۔ وٹے کا خیال ہے کہ اس موقعہ پر "لی ہنگ چنگ" کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے رشوت ستانی سے کام لیا گیا (سوانح عمری مصنفۂ وٹے) اسی عرصہ میں جرمنی نے "شان ٹنگ" کے علاقہ میں "کیاؤچاؤ" کا ٹھیکہ لیا کیونکہ اِس صوبہ میں اُس کے دو مشنری مارے گئے تھے اور چین نے اس کے تاوان میں یہ معاہدہ کر لیا۔ اسی طرح فرانس کو بھی اسی قسم کی مراعات جنوبی چین میں حاصل ہو رہی تھیں۔

روس اور جاپان کی جنگ ۱۹۰۴ء

برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کو اس باہمی تقسیم سے قدرتاً خطرہ پیدا ہوا اور وہ آپس میں متحد ہو گئے برطانیہ نے چاہا کہ روس یا جرمنی وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے اور اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ چین کے کسی علاقہ پر سیاسی قبضہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن اُنھوں نے کسی فیصلہ کُن معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اُدھر روس خفیہ طور پر ارادے کر رہا تھا کہ کسی طرح سے کوریا پر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنے گزشتہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا شروع کر دی۔ جاپان نے درخواست کی کہ اگر کوریا میں اُس کا اقتدار

مان لیا جائے تو وہ روس کے منچوریا میں خاص حقوق تسلیم کرے گا، لیکن روس نے یہ ناپسند کیا۔ آخر کار ۱۹۰۴ء میں جاپان نے تمام گفت و شنید کو بالائے طاق رکھ کر اعلانِ جنگ کر دیا اور اس مرتبہ وہ مکمل طور پر طیار تھا۔ اُسنے اپنی فوج کو جنگِ چین کے بعد از سرِ نو منظم کیا تھا اور تعداد میں بھی روس کے وہم و گمان سے بالاتر اُس کو بڑھا لیا تھا۔

جاپان کو اس جنگ میں نمایاں فتح حاصل ہوئی اور روس کا جنگی بیڑا بالکل تباہ ہو گیا۔ آخر کار اُس کو کوریا میں جاپان کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا اور چین سے مشورہ کے بعد لیاؤ ٹنگ اور مشرقی چینی ریلوے کی جنوبی شاخ بھی (جو پورٹ آرتھر سے "چنگ چن" تک تھی) اُس کو دیدی۔ روس کو منچوریا کے متعلق اپنے خاص حقوق واپس لینے پڑے اور فیصلہ ہوا کہ منچوریا کے دروازے ہر قوم کے لئے کھلے ہیں۔

زرد خطرہ

اس فتح سے جاپان کی ہمت اور بڑھ گئی اور منچوریا میں اس کے اقدامات زیادہ وسیع ہونے لگے۔ ۱۹۱۵ء میں چین کے ساتھ اُس کا ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے منچوریا کے سولہ شہر خارجی تجارت کے لئے کھول دئے گئے اور جاپان کو حق حاصل ہوا کہ وہ کمڈن سے ان ٹنگ تک اپنی ریلوے مکمل کرے۔ جو دوران جنگ میں ادھوری رہ گئی تھی۔ یہ بھی قرار پایا کہ اُس علاقہ میں چین کوئی متوازی ریلوے نہیں بنائے گا۔ مگر بعد میں اس معاہدہ کی خلاف ورزیاں ہوتی رہیں اور بالآخر چین نے ایک ریلوے بنالی۔ دونوں قوموں نے دوسرے ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف اُبھارنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں کئی بار معاہدے ہوئے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یورپی طاقتیں جاپان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں سے لرزاں تھیں اور وہ ہر دم یہی چاہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طریق سے "زرد خطرے" کا قلع قمع کیا جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۱-۲۲ء کی واشنگٹن کانفرنس میں جاپان کی بحری طاقت کو مسلوب کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سنگاپور میں ایک مضبوط برطانوی بیڑا رکھا گیا۔ اُدھر امریکہ کو خطرہ تھا کہ کہیں جاپان بحرالکاہل پر قابض نہ ہو جائے اس لئے اُس نے زور دیا کہ جاپان کا بیڑا امریکہ اور انگلستان کے بیڑوں سے بہر حال کمزور ہو۔

۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۱ء تک جاپان اپنے اندرونی معاملات میں مشغول رہا کیونکہ ۱۹۲۳ء کے ہیبت ناک زلزلے نے جاپان کے سرمایہ کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور اُس کو از سرِ نو اپنی حالت سنبھالنے کے لئے اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کرنی پڑیں۔ اس لئے وہ خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتا رہا کہ کس طرح چین میں قومیت زور پکڑ رہی ہے اور اُس کے مال کا مقاطعہ کیا جا رہا ہے۔ اور روس میں پنجسالہ اسکیم کامیاب ہو رہی ہے۔ بالآخر ۱۹۳۱ء میں جب اُس نے دیکھا کہ اب خاموش بیٹھنا گناہ ہے تو اُس نے چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

منچوریا سے جاپان کی دلچسپی

اس باہمی آویزش کے کئی سبب ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ جاپان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن وسائلِ خوراک اُسی نسبت سے ترقی نہیں پاتے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جاپان میں طریقۂ فلاحت ہندوستان کی طرح تا حال دقیانوسی ہے اور

اکتشافات عصریہ سے بالکل روشناس نہیں ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ جاپان کے لوگ ضرورت سے زیادہ قومیت پسند واقع ہوئے ہیں اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کو کسی وقت باہر کے چاول (جن کو وہ ازرہِ طنز "خارجی چاول" کہتے ہیں) کھانے پڑ جائیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ میکسیکو وغیرہ کے چاول جاپان بھیجے جائیں لیکن اُن کا خیر مقدم نہ کیا گیا۔ بہرحال جاپان کی آبادی ۱۸۶۸ء سے اسوقت تک دوچند سے زیادہ ہو چکی ہے لیکن وسائلِ رسد تا حال وہی ہیں۔ اس وجہ سے جاپان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی مملکت کو وسیع کرے اور کوئی قریب ترین علاقہ اپنے ساتھ ملحق کر لے تاکہ ایک طرف تو اُس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کھپت ہو جائے اور دوسری طرف اُس کو اپنی مصنوعات کے لئے ایک نفع بخش منڈی مل جائے۔

اسی خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جاپان کی یہ خواہش عرصہ سے تھی کہ کسی طرح منچوریا کے علاقہ پر قبضہ حاصل کر لیا جائے۔ یہ علاقہ زراعت کے لحاظ سے نہایت امید افزا ہے ابھی تک اس میں صرف آٹھ کروڑ ایکڑ زمین زیرِ کاشت ہے اور قریباً چھ کروڑ ایکڑ ایسے باقی ہیں جن میں نہایت عمدہ کاشت ہو سکتی ہے۔ اس علاقہ کی سب سے اہم پیداوار مٹر ہے جس کی مختلف قسمیں تمام یورپ میں انسان اور حیوان کی خوراک اور کھاد کیلئے مستعمل ہوتی ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں چودہ کروڑ من غلّہ یہاں پیدا ہوا جو ہر چند کاشت کے لحاظ سے منچوریا کے زمیندار کا رہینِ منت ہے لیکن اُس کی فروخت اور عمدگی کی ذمہ دار جاپان کی تجارتی اور کیمیاوی تدابیر تھیں۔ گیہوں، اُرد اور چاول اس جگہ کی دیگر زراعتی پیداواریں ہیں جو اگر کوشش کی جائے تو زیادہ تعداد میں کاشت کی جا سکتی ہیں۔ شمال میں ایک وسیع علاقہ ایسا ہے جو جنگل ہی جنگل ہے اور لکڑی کا بہترین مخزن ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ علاقہ معدنیات کے لحاظ سے بھی بُرا نہیں۔ اسوقت جاپان اپنی تیل کی ضروریات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے پورا کرتا ہے اور مشینری وغیرہ بھی امریکہ اور برطانیہ سے منگواتا ہے لیکن اگر وہ تمام چیزیں منچوریا سے حاصل کر سکے تو دولِ یوروپ کے مقاطعہ کا ڈر اسے باقی نہیں رہتا اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا کے ساتھ جاپان کی دلچسپی بجائے تجارتی اور صنعتی ہونے کے زیادہ تر فوجی لحاظ سے ہے اگر آج ہندوستان اپنی روئی کی برآمد جاپان میں بند کر دے یا آسٹریلیا سے وہاں ذرہ بھر بھی اون نہ آئے یا ملایا ربڑ دینے سے انکار کر دے یا امریکہ اقتصادی لحاظ سے قطع تعلق کر لے تو جاپان بالکل بیدست و پا ہو جائے اسی خطرہ کے ازالہ کے لئے جاپان اپنی مملکت کو وسیع کرنا چاہتا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو وہ کافی بالذات رہے۔

روسی خطرہ جاپان کے خطرہ کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ایشیا میں روسی طاقت کا از سرِ نو اقتدار پذیر ہونا ہے۔ روس نے ۱۹۲۸ء میں ایک اقتصادی پنجسالہ پروگرام بنایا تھا جس کی رو سے وہ اپنے چیدہ چیدہ شعبہ جات کو یکدم بامِ رفعت تک پہونچانا چاہتا تھا اور اِس طرح اُس کی خواہش تھی کہ وہ نہ صرف

اقتصادی طور پر خود مختار ہو جائے بلکہ اس کے ذریعہ سے وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لے۔ یہ اسکیم ۱۹۳۳ء میں مکمل ہوئی اور ارباب سیاسیات کا خیال ہے کہ روس اب اسقدر مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہو چکا ہے کہ اگر ساری دنیا اُس کا مقابلہ کرنا چاہے تو بھی اس کو نقصان نہیں پہونچ سکتا سب سے نزدیک حکومت جس کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ ہو سکتا ہے وہ جاپان ہے۔ روس نے اب ایک دوسرا اقتصادی پروگرام شروع کیا ہے جس کی روز افزوں ترقی جاپان کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی ہے اُدھر روس نے ٹرانس سائبیرین ریلوے کی پٹڑی دوہری بنالی۔ اس لئے جاپان کو ہر دم یہی فکر ہے کہ اگر روس کی تمام تجاویز مکمل ہو گئیں تو اُس کا کیا حشر ہوگا۔

مشرقِ اقصیٰ میں فوجی اقتدار کا خواب

لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس کا شگون اچھا نہیں جاپان کی خارجی پالیسی آج کل اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو مشرقِ بعید میں کسی غیر شخص کا اقتدار برداشت نہیں کر سکتے وہ چاہتے ہیں کہ جاپان کو وہی اختیارات حاصل ہو جائیں جو اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پاس ہیں۔ یعنی جس طرح دولِ یوروپ "نئی دنیا" کے کسی علاقہ پر بغیر امریکہ کی رضامندی کے قبضہ نہیں کر سکتے اور نہ وہاں زمینیں خرید سکتے ہیں اسی طرح حکومتِ جاپان کو بھی یہ اختیار مل جائے کہ وہ مشرقِ بعید کے کسی علاقہ میں یورپی طاقت کو داخل نہ ہونے دے۔ اس اختیار کو Doctrine of Monroe) یا "نظریہ منرو" کہتے ہیں اور یہ امریکہ کو معاہدۂ لیگ آف نیشنز کی اکیسویں دفعہ کے مطابق ملا ہے اس کا اگرچہ یہ مطلب نہیں کہ پریزیڈنٹ متحدہ امریکہ کو جنوبی امریکہ یا کریبین میں کلی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں لیکن ان اختیارات کی تفسیر یقیناً اُسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ جب چاہے ان علاقوں کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے اور دیتا رہا ہے بلکہ کئی مرتبہ پولیس کا استعمال بھی کیا ہے انہی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جاپان کا یہ تقاضا ہے کہ مشرقِ بعید کے معاملہ میں اُسے بھی ایسے اختیارات دیدئے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ چاہتا ہے کہ مشرقِ اقصیٰ میں کوئی یورپی طاقت اپنے لئے آراضی نہ خرید سکے اور چین کے متعلق اگر بیرونی حکومتیں کوئی قدم بڑھانا چاہیں تو پہلے جاپان سے مشورہ کر لیا جائے۔ تیسرے اگر وہ مناسب سمجھے تو چین کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے۔ چوتھے اگر وہ ضرر دے تو کوئی مغربی طاقت حایل نہ ہو اب اس مطالبہ کی موافقت میں جاپان کے دلائل خواہ کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں مگر جو حکومتیں چین اور بحر الکاہل سے دلچسپی رکھتی ہیں وہ کبھی اس کو برداشت نہیں کریں گی۔ اسی وجہ سے جاپان سمجھتا ہے کہ لڑائی کا ہونا ضروری ہے اور اُس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ منچوریا پر قبضہ کر کے اپنی سیاسی اور اقتصادی طاقت کو بڑھائے۔

عبدالرحیم شبلی

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

سالگزشتہ جناب اصغر نے سرودِ زندگی کی ایک جلد میرے پاس ریویو کے لئے روانہ کی تھی اور میں نے کتب موصولہ کے سلسلہ میں مختصراً اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن چونکہ تفصیلی مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لئے باب الانتقاد کے ماتحت اظہار خیال سے معذور رہا۔

اس دوران میں اتفاق سے مجھے دو چار دن کے لئے لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو اس مجموعہ کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ اور اس طرح مجھے کافی وقت اس سے لطف اندوز ہونے کا مل گیا۔

اس سے قبل، جناب اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زاید بار اپنی رائے نگار کے صفحات پر ظاہر کر چکا ہوں اور اب بھی جو کچھ لکھوں گا وہ بہ لحاظ نتیجہ شاید اسی کا اعادہ ہو گا لیکن چونکہ جناب اصغر اپنی شاعری کے لحاظ سے ایک مخصوص امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں اس لئے نہ اُن کے اس جدید مجموعۂ نظم پر یوں سرسری گزر جانا مناسب ہے اور نہ کوئی حرج اگر میں اپنی کسی سابق رائے کی توثیق میں کوئی مزید ثبوت پیش کر سکوں۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۰۲ صفحات اور زیادہ سے زیادہ تین چار سو اشعار پر مشتمل ہے، لیکن ہے بہرحال "مجموعہ" اس لحاظ سے بھی کہ "نشاطِ روح" کی اشاعت کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ اس کی ہر غزل بجائے خود اک "نظم" کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم سے میری مراد اس شاعری سے ہے جو تغزل سے کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو۔ خود اصغر صاحب اس کو غزلوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں یا منظومات کا، مجھے اس کا علم نہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ تفریق ہی سرے سے بے معنی ہو بہرحال میرے لئے یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ میں اس مجموعہ کو صرف غزلیات کا مجموعہ کہوں یا صرف منظومات کا کیونکہ جب میں تغزل کی جستجو کرتا ہوں تو ساتھ ہی ساتھ نظم کے رنگ کے اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں اور جب غیر تغزلانہ شاعری کی مثالیں ڈھونڈھتا ہوں تو بعض جگہ غزل کیا

"غزل الغزلات" ہاتھ آجاتی ہے۔

اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے باوجود تقشف مذہبی نہایت نیک نفس انسان ہیں اور اپنے اعمال و اوراد کے لحاظ سے اچھے خاصے مرد متورع، اس لئے اصولاً انھیں شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونا چاہئے تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ صاحب حال و قال صوفی بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک صوفی حال سے گزر کر قال میں آتا ہے تو وہ اکثر شعر ہی کہتا ہے، اور صرف اپنے لئے یعنی وہ خود کہتا ہے اور خود ہی اس کو سمجھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اصغر صاحب کی شاعری کا بھی اکثر حصہ اسی قسم کا ہے کہ اگر کسی کو تصوف کے مدارج عالیہ حاصل نہ ہوں، تو اس بدنصیب کو ہمیشہ اپنے قصور فہم کا اعتراف کرنا پڑے گا اور باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے گا جو الفاظ کے اندر محصور ہو کر شاید کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال میں نے صرف اپنی بلید ذہنیت کو سامنے رکھ کر ظاہر کیا ہے، جو آج سے نہیں بلکہ ابتدا ہی سے مجھ پر مسلط ہے۔

میں نے جس وقت ہوش سنبھالا تو ایک طرف مولویوں سے گھرا ہوا تھا اور دوسری طرف صوفیوں سے، یعنی اگر پانچ وقت کی نماز تازہ وضو سے باجماعت ادا کرنا میرے فریضۂ زندگی میں داخل تھا تو قوالی کی صحبتوں میں شریک ہونا بھی اسی حد تک لازم، لیکن باور کیجئے کبھی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ زیادہ نمازیں پڑھنے والا کیوں زیادہ خشک و عبوس ہوتا ہے اور موسیقی ایسی لطیف چیز کے ذریعہ سے کیوں ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ معشوق سے مراد کوئی خوبصورت عورت نہیں بلکہ سفید داڑھی والا پیر خانقاہ ہے، میں نے ایک بزرگ کے سامنے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تو انھوں نے اپنے پندار میں حد درجہ ذہانت صرف فرماتے ہوئے جواب دیا کہ "پیر خانقاہ نہ سہی، خدا سہی، ایک ہی بات ہے"، وہ مسکرا رہے تھے اور میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا تھا، وہ سمجھ رہے تھے کہ اب اسکے آگے کوئی کیا کہہ سکتا ہے، اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ چند دن مجھے ان حضرت کے پاس رہنا پڑ جائے تو میری موت ضغطۂ قلب سے ہو یا تپ دق سے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ فارسی کے صوفی شعراء کی غزلوں میں بھی مجھے کبھی کوئی لطف نہیں آیا، اردو والوں کا کیا ذکر ہے کہ یہاں تو سوائے نقل و اتباع کے وہ برخود غلط جوش بھی نہیں ہے جو اُن کے یہاں پایا جاتا ہے

جن حضرات کو خانقاہوں کی مجلس سماع میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ صوفیہ کو سب سے زیادہ حال جن اشعار پر آتا ہے وہ وہی ہیں جن میں "ہمہ اوست" کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ فلسفہ صحیح ہے یا غلط، بلکہ سوال یہ ہے کہ اس کو شاعری سے کیا واسطہ، محبت سے کیا تعلق آپ اگر خدا کا جلوہ بلکہ عین ذات خدا کو ہر ہر چیز میں ساری و طاری دیکھتے ہیں تو دیکھئے شوق سے دیکھے جائیے، لیکن آپ اسے اُس زبان (تغزل) میں کیوں بیان کرتے ہیں جس کے لطف کی ابتدا ہی خدا کے بھول جانے

سے ہوتی ہے۔

آپ تمام صوفیہ کے کلام کا مطالعہ کر جایئے سوائے چند مخصوص اُلجھے ہوئے خیالات کے آپ کو کوئی نئی بات نہ ملے گی، مثلاً :-

۱۔ تو میں ہے، میں تو ہوں، پھر تو تو کیسا، میں میں کیوں ؟

۲۔ تو ہی شاہد ہے، تو ہی مشہود ہے، پھر مشاہدہ کیسا ؟

۳۔ تو نے مجھے دیکھا، مگر تو مجھ میں ہے اس لئے تو نے خود کو دیکھا، اور خود کو کیا دیکھا، اپنے دیکھنے کو دیکھا، نہ دیکھ سکنے کو دیکھا

۴۔ قطرہ دریا ہے اور دریا قطرہ، نہ معلوم قطرہ دریا میں سمایا ہوا ہے یا دریا قطرہ میں

۵۔ حجاب حُسن خود حُسن ہے اور حُسن خود حجاب، اس لئے نہ حجاب حجاب رہا نہ حُسن حُسن

۶۔ وہی ساز کا تار ہے اور وہی ساز، وہی مغنی ہے اور وہی گوش بر آواز۔ پھر یہ صدائے لنترانی کیسی ؟ وغیرہ وغیرہ

ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی نہایت بلند فلسفہ ہو، اعلیٰ درجہ کی للہیت ہو، لیکن عشق کی دنیا میں اور دنیا کی کارگاہ عشق میں اس قدومیت سے کیا کام چل سکتا ہے۔ اگر قطرہ دریا ہے اور دریا قطرہ تو ہوا کرے، محبت میں پھنکنے والے دل کی آگ تو اس سے نہیں بجھ سکتی، اگر "تو میں ہو گیا ہے اور میں تو" تو بلا سے ہو جائے، عاشق کو اس "تو تو میں میں" سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

غزل نام ہے ان باتوں کا جو گوشت پوست والے عاشق اور گوشت پوست والی معشوقہ کے درمیان ہوا کرتی ہیں، وہ اس سے ملنا چاہتا ہے اور اسی حس کے ساتھ اسی تمنا کے ساتھ جو ایک انسان میں دوسرے انسان کے لئے پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر آپ لاکھ کہئے کہ "تو وہ ہے اور وہ تو" لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں اسوقت تک نہیں آسکتی جب تک "وہ" اُس کی آغوش میں نہ ہو۔ خدا سے محبت کرنے کے سلسلہ میں ممکن ہے یہ "اڑن گھائیاں" کام دے جائیں، لیکن ایک انسان کی محبت انسان سے، کبھی ان چیستاں طرازیوں سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ الغرض یہ "جھاڑ پھونک" والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک اسکا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اصغر صاحب کے پہلے مجموعہ میں بھی جو نشاطِ روح کے نام سے شایع ہوا تھا اس نوع کے اشعار کی کمی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں انھوں نے تصوف کے زیادہ بلند مدارج طے کر لئے ہیں اور اسی لئے انکے دوسرے مجموعہ میں پہلے سے کہیں زیادہ یہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔

شاعری خواہ کسی موضوع کو سامنے رکھ کر کیجائے دو قسم کی ہوا کرتی ہے، ایک وہ جس میں کسی حال یا واقعہ

کا اظہار ہوا اور دوسری وہ جس میں کوئی دعویٰ پیش کیا جائے۔ اول الذکر بہت آسان چیز ہے لیکن دوسری قسم نہایت مشکل ہے، کیونکہ دعوے کے ساتھ اس کا ثبوت فراہم کرنا ضروری ہو جاتا ہے، صوفی شعراء اکثر و بیشتر اسی قسم کی شاعری کرتے ہیں جس میں اول تو دعویٰ ہی بالکل مہمل زبان میں کیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ کبھی اپنے دعوے کا ثبوت پیش نہیں کرتے، وہ ایک بات خود فرض کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا بغیر کسی دلیل و برہان کے اسکو صحیح سمجھنے لگے۔ اس کا دوسرا نام انھوں نے "فلسفیانہ شاعری" بھی رکھا ہے۔ اب میں اصغر صاحب کے کلام سے چند مثالیں پیش کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بھی کس فراخدلی سے اس "فلسفیانہ" شاعری سے کام لیا ہے اور کتنے دعوے انھوں نے ایسے کئے ہیں جس کی دلیل شعر میں کیا غالباً خود ان کے ذہن میں بھی موجود نہ ہوگی۔

اُٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پر لا کر
شہود غیب ہوا، غیب ہو گیا ہے شہود

یہ شعر ان کی غزل کا ہے، کسی مسلسل نظم کا نہیں کہ اس کا تعلق ماسبق یا مابعد سے ہو۔ اپنی جگہ ایک مستقل مفہوم رکھتا ہے لیکن وہ مفہوم کیا ہے۔ اس کو خدا ہی بہتر جان سکتا ہے۔ میں اس کے دوسرے مصرعہ کو جب بار بار دہراتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی ہلاکت کے لئے کوئی "سیفی" پڑھ رہا ہوں

عرش کو فرش پر لا کر رکھنا، شہود کا غیب اور غیب کا شہود ہو جانا، ان میں سے ہر دعویٰ بجائے خود ایک چیستاں ہے اور عقل حیران ہے کہ اصغر صاحب نے کس حال کے ماتحت تصوف کے کس رمز عظیم کو اسمیں ظاہر کیا ہے۔ اگر عرش سے مراد خود اُن کی ذات مراد ہے تو غیب کا شہود میں آجانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن شہود کا غیب ہو جانا کیسا؟ اصغر صاحب نے خود ایک جگہ غزل کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ:-

اصغر غزل میں چاہئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں، جو مستی شراب میں

ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس "غیب و شہود" والے شعر میں "حسن بتاں" بھی نظر آتا ہو اور "مستی شراب" بھی لیکن مجھے تو یہ بالکل درود شریف کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور دعویٰ ملاحظہ ہو:-

کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

لاہوت کے معنی الوہیت کے ہیں اس کی اصل لاہ ہے جو الٰہ کے معنی میں آتا ہے اس میں دو حرف (و ا ہ) اور (ت) مبالغہ کے اضافہ کئے گئے ہیں، اس لئے پہلے مصرعہ کے معنی یہ ہوئے کہ "میری حقیقت ذات خداوندی

سے نسبت رکھتی ہے"۔ بہتر ہے، رکھتی ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق۔ ہیولیٰ، مادۂ اولیٰ کو کہتے ہیں اور صوفیہ کے نزدیک مادۂ اولیٰ بھی اسی ذات خداوندی سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے لاہوتی ہونا ہیولائے ارتقا کے منافی کیونکر ہوا۔ یہ تو نقص معنوی ہوا اب بیان کے سقم کو دیکھئے کہ پہلے مصرعہ میں (کبھی سنا) کا ٹکڑا نظم کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں (کہیں یہ ضد)۔ اس لئے تقابل کی صورت پیدا نہ ہوئی۔

اگر یہ شعر یوں ہوتا:۔

کبھی یہ ہٹ کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کبھی یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

تو کم از کم یہ سقم دور ہو جاتا۔

یہ شعر اصغر صاحب کی ایک نظم "کیا ہوں میں" کا ہے، جس میں متعدد اشعار ایسے ہی لاہوتی قسم کے نظر آتے ہیں مثلاً:۔

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو میں لذت ہے
فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہوں میں

فضا میں تحلیل ہو جانا" بالکل علمی بات ہے جس کا تعلق طبیعیات اور علم الکیمیا سے ہے، نہ کہ تصوف و شاعری سے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے استعارتاً اس کو گم ہو جانے کے معنے میں لے لیا جائے تو بھی پہلے مصرعہ سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور لذت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔

اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو کی غایت ہے

تو خیر ایک مفہوم یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جستجو میں خود آپ کو گم کر دینا جستجو کی انتہا ہے۔

ایک اور شعر اسی نظم کا ملاحظہ ہو:۔

کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لیکر
فریب خوردۂ عقل گریز پا ہوں میں

اس شعر سے یہ بات بالکل ظاہر نہیں ہوتی کہ مشعلِ یقیں لیکر کس کو سامنے آنے کی دعوت دی جاتی ہے اگر اس سے مراد علاوہ اپنے کوئی اور ہے تو انداز بیان درست نہیں کیونکہ اس سے مبارز طلبی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ التجا، شاعر غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ عقل کی فریب خوردگی صرف یقین کی کیفیت سے دور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو وہ اچھی طرح ظاہر نہ کر سکا، اول تو پہلے مصرعہ میں مشعل کا لفظ بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ دوسرے مصرعہ میں تاریکی کا

مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا، اس لئے بجائے مشعلِ یقین کے حجتِ یقین لکھنا چاہئے تھا تاکہ فریب کا تقابل ہو جاتا۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا انداز بیان یہ نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ اس میں التماس و التجا کی کیفیت پیدا کرنا چاہئے تھی۔ دوسرے مصرعہ میں عقل کی صفت گریزپا سراسر بے محل ہے۔

عقل گریزپا کے معنے ہوئے "جلد زایل ہو جانے والی عقل" کے، درانحالیکہ مفہوم شعر کو دیکھتے ہوئے عقل دیرپا ہونا چاہئے تھا ورنہ فریب خوردگی ناتمام رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس شعر کو اس طرح بلند کیا جا سکتا ہے:۔

نہیں ہوں درخورِ ایقاں، یہ جانتا ہوں مگر
فریب خوردۂ عقل گریزپا ہوں میں

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

کچھ انتہا نہیں نیرنگ زیست کی میرے
حیات محض ہوں، پروردۂ فنا ہوں میں،

پہلے مصرعہ میں تو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نیرنگ زیست کی کوئی انتہا نہیں اور ثبوت میں اس نیرنگ کے صرف دو منظر (حیات محض اور پروردگی فنا کے) پیش کئے گئے ہیں، علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں انداز بیان غیر متوازن ہے، اگر حیاتِ محض کہا تھا تو تقابلاً فنا محض کہنا چاہئے تھا، پروردۂ فنا ہونے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ یہ پورا شعر اس طرح بدلا جا سکتا ہے:۔

عجب تضاد ہے نیرنگِ زیست میں میرے
حیات محض کبھی ہوں، کبھی فنا ہوں میں

بعض کا خیال ہے کہ جناب اصغر غزلگو شاعر نہیں ہیں بلکہ نظم نگار ہیں۔ لیکن آپ نے ابھی دیکھا کہ نظم میں ان کا رنگ شاعری کیا ہے ایک دوسری نظم اور ملاحظہ ہو جس میں مسلم سے خطاب کیا گیا ہے:۔

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محو تماشا ہے
جب اس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے

ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلف برہم کی
فضائے حسنِ ایماں انعکاس روئے زیبا ہے

جہان آب و گل میں ہے شرار زندگی تجھ سے
تری ذات گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے

تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی
کہ سب مے کی بدولت اصطلاح جام و مینا ہے

ضوابط دین کامل کے دئے ہیں تیرے ہاتھوں میں
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

تجھی کو دیکھتا ہوں روح اقوام و مذاہب میں
یہ راز زندگی سن لے کہ ہر قطرہ میں دریا ہے

فرشتوں نے وہاں پر حرز جاں اس کو بنایا ہے
فراز عرش پر تیرا ہی کچھ نقش کف پا ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا — اگر اغراض ہو تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے
فرائض کار ہے احساس عالم کے مظاہر میں — یہی عارف کا مقصد ہے، یہی شارع کا ایما ہے

اس نظم پر اظہار خیال کی ضرورت نہیں، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شروع سے لیکر اخیر تک سوائے آورد و تصنع کے اس میں اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی جوش و ولولہ ہے، نہ کوئی تاثر و کیفیت، نہ بیان میں کوئی جدت ہے نہ خیال میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے راہ نجات پڑھ رہے ہیں۔

پھر اگر سیدھی سیدھی باتیں کی جاتیں تو بھی خیر سادگی کا لطف آجاتا، لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اس میں بھی وہی تصوف کا جامع اضداد اور مفروضاتی لٹریچر موجود ہے۔ للّٰہیت۔ ہیولیٰ۔ ارتقا۔ عارف، شارع۔ عرش وغیرہ یہ سب اس قبیل کے الفاظ ہیں جن کو شاعری کی لطافت مشکل سے برداشت کر سکتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اصغر صاحب باوجود ایک معیاری مسلمان ہونے کے کیونکر ایسی پھیکی، اسدرجہ بے کیف اور اسدرجہ بے معنی و بے نتیجہ نظم لکھ سکے۔ اس نظم میں مسلم سے خطاب ہے اور اسی کو مقصود آفرینش قرار دیا جاتا ہے لیکن دوسرے شعر میں ہجوم کفر کو بھی اسی کی زلف برہم کی جنبش بتا کر تفریق کفر و ایماں کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ الغرض نہ کوئی پیام ہے نہ درس عمل نہ کسی مقصد کی تعیین ہے نہ کسی منزل کی تخصیص، منتشر و پریشاں خیالات ہیں جنھیں زبردستی ایک سلسلہ سے وابستہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ نظمیں اس مجموعہ میں یہی دو ہیں، اس لئے آیئے اب غزلوں کی طرف متوجہ ہوں۔

اصغر صاحب کی غزلوں میں تین قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک وہ جو واقعی صحیح تغزل کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم ہیں، تاہم میں مضمون کے آخر میں ان سب کو یکجا درج کر دوں گا۔

دوسری قسم اُن اشعار کی ہے جن کا کوئی مفہوم تو کھینچ تان کے پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن تغزل سے انھیں کوئی علاقہ نہیں اور تیسری قسم میں وہ اشعار داخل ہیں جو نہ غزل ہیں نہ نظم اور جن میں شاعر اپنے مقصود کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہوا ہی نہیں۔

سب سے پہلے میں اسی موخرالذکر قسم کے اشعار کو پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ دیوان کا اولین شعر خیر سے اسی رنگ کا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ترک مدعا کر دے عین مدعا ہو جا — شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

یہ شعر خالص فلسفۂ تصوف کی پیداوار ہے اور سوائے لفظوں کی اُلٹ پھیر کے اس میں قطعاً کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اصغر صاحب ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہیں کہ انھوں نے صرف ترکِ مدعا پر قناعت کی ورنہ صوفیہ کے یہاں تو یہ منزلیں چار ہیں:۔ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک۔

اور اسی لئے اس مسلک کے صوفیہ جو ٹوپی استعمال کرتے ہیں اسے "کلاہِ چار ترکی" کہتے ہیں۔ اصغر صاحب تو ترکِ مدعا کے بعد مظہرِ خدا ہو جانا ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ تیسری منزل "ترکِ خدا" کی ہے اور چوتھی اس سے زیادہ بلند "ترکِ ترک" کی یعنی "خیالِ ترک" بھی ترک ہو جائے۔ بہرحال اگر ان مفروضات مہملہ کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ شعر نہ صرف یہ کہ بلند مرتبہ کا نہیں بلکہ غلط بھی ہے کیونکہ لف و نشر کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا عین مدعا (دوسرے مصرعہ کا) "مظہرِ خدا" قرار پاتا ہے، اور خدا و مظہرِ خدا میں زمین و آسمان کا فرق ہے، صوفیہ کے یہاں مظہرِ خدا تو ہر چیز ہے، یہاں تک کہ ایک [illegible] فروتر زندیق بھی مظہرِ خدا ہے، اس لئے ترکِ مدعا کے بعد ارتقا تو اسوقت ہوتا جب بجائے مظہرِ خدا کے عینِ خدا کہا جاتا۔

اس غزل کا مقطع بھی اسی شان کا ہے:-

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو — اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا کوئی مفہوم پیدا کر سکوں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ پہلے مصرعہ میں قطرہ تنک مایہ سے خطاب ہے، یعنی قطرہ کو شاعر خود بھی تنک مایہ سمجھتا ہے درانحالیکہ فوراً اس کے بعد ہی اس کے بحرِ بیکراں ہونے کی خبر دیتا ہے اور اس طرح تضادِ بیان ظاہر ہے۔ اگر قطرۂ تنک مایہ سے مراد وہ قطرہ ہے جو خود اپنے کو تنک مایہ سمجھتا ہے تو ترکیب سے متبادر نہیں۔ لیکن اگر اسے بہ سبیل "تعریض" یا نظر "بہ صورتِ ظاہری" گوارا بھی کر لیا جائے، تو دوسرے مصرعہ کا کیا علاج ہے۔

کسی چیز کا "اپنی ابتدا ہونا اور پھر اپنی ہی انتہا ہو جانا" عجیب و غریب معمہ ہے۔ اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ "جو تیری ابتدا ہے وہی تیری انتہا ہے"، تو الفاظ سے ظاہر نہیں۔ اپنی اور ہو کر دونوں لفظ بالکل بیکار و لایعنی طور پر نظم کئے گئے ہیں۔

شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذروں میں — حجابِ حسن ہے آئینہ دارِ حسن نمود

پہلا مصرعہ دوسرے سے بالکل بے تعلق ہے۔ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ ذروں میں شعاعِ آفتاب کی جولانیاں پائی جاتی ہیں، بالکل ٹھیک۔ ہر شخص واقف ہے، انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں ذروں کو حجابِ حسن کہنا بالکل خلافِ حقیقت و واقعہ ہے، کیونکہ وہ شعاعِ آفتاب کی راہ میں کبھی حایل نہیں ہو سکتے،

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخی پنہاں — چھپایا معنیِ گل میں کبھی حسن نمایاں کو

پہلے مصرعہ میں (پر) کا استعمال غلط ہے، (سے) ہونا چاہئے یا (میں) اور دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ (معنیِ گل) کوئی علٰحدہ چیز (گل) سے نہیں ہے۔ اگر (نکہت گل) کہتے تو بیشک (صورتِ گل) سے تفریق ہو سکتی تھی۔

یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

دکھایا برگ گل سے کاہ رنگِ شوخیِ پنہاں چھپایا نکہت گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

یہ راز ہے میری زندگی کا پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ میں خودی میں مبتلا ہوں، لیکن یہ زندگی کا راز کب ہوا۔ بجائے (راز) کے (حال) یا (رنگ) کہنا چاہئے تھا۔ صرف ایک لفظ (راز) نے شعر کو بے معنی کر دیا۔

عالم پہ ہے اک سکون بیتاب یا عکس ہے میری خامشی کا

پہلے مصرعہ میں وہی "ادعائے بے دلیل" کا نقص موجود ہے۔ کیونکہ عالم پر "سکون بیتاب" ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ حقیقتاً عالم پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اگر بجائے عالم کے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا جاتا جس میں واقعی کوئی سکون پایا جاتا ہے تو بیشک کسی دلیل لانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

ہے بحر پر اک سکونِ بیتاب

تو یہ اعتراض وارد نہ ہوتا، کیونکہ بحر میں واقعی اک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جس میں سکون و بیتابی دونوں شامل ہیں۔

یاس ایک جنونِ ہوشیاری امید فریب زندگی کا

امید کو تو خیر فریب زندگی کہنا غلط نہیں، لیکن یاس کا (جنونِ ہوشیاری) ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، یاس اور جنون دونوں کی کیفیتیں بالکل متضاد ہیں اس مے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

یاس ایک سکون ہوشیاری

اس کے سوا تو معنیِ مجنوں بھی کچھ نہیں ایسا بھی ربط صورتِ لیلیٰ نہ چاہئے

یعنی صورتِ لیلیٰ کے ساتھ اتنا ربط کہ مجنوں کا مفہوم سوائے اس ربط کے اور کچھ نہ رہجائے، مناسب نہیں ہے حالانکہ عشق کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حسن کے نام سے پکارا جانے لگے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) بالکل غلط استعمال ہوا ہے، کیونکہ اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جب مجنوں کا مفہوم بھی سوائے ربطِ صورتِ لیلیٰ کے اور کچھ نہ رہا تو اوروں کا بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہئے۔ حالانکہ مجنوں کے علاوہ اوروں کو لیلیٰ سے کیا تعلق؟

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

اگر دوزخ کو فردوسِ حسن کا جلوہ کہنا درست ہو سکتا ہے تو فردوس کو نمونۂ جہنم بھی کہہ سکتے ہیں پھر کیوں نہ یہ شعر اس طرح پڑھا جائے:۔

جنت بھی ایک شعلۂ نارِ جحیم ہے جو اس سے بیخبر نہیں وہ ہیں عذاب میں
میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی معنوی تعلق نہیں رکھتا۔ آسمان پر اگر تارے بکھرا دئے گئے ہیں تو ندائے درد سے اسکو کیا واسطہ۔ اگر مراد یہ ہے کہ "رات بھر تارے گنا کرد" تو لفظ (کچھ) بیکار ہے، کیونکہ قلت کو ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ اسکے لفظ مہ کے ساتھ یوں بھی (کچھ) کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ کرۂ ارض کا چاند تو ایک ہی ہے۔

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

اگر زندگی کا راز واقعی تلاشِ سراب ہے تو موت کا راز جستجوئے حقیقت ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ مہمل نظریہ، سب سے زیادہ مستحق ستائش سمجھا جاتا ہے۔

کچھ شورشوں کے نذر ہوا خونِ عاشقاں کچھ جم کے رہگیا اسے حرماں بنا دیا

یہ بالکل جدید اکتشاف ہے کہ جس چیز کو یاس و حرماں کہتے ہیں وہ عاشقوں کا منجمد خون ہے، اگر یہ شعر یوں ہوتا:-

جو خون بہ گیا اسے امید کر دیا جو جم کے رہگیا اسے حرماں بنا دیا

تو حرماں کے مقابلہ میں امید کے اجزاء ترکیبی کی بھی تحلیل ہو سکتی۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہو کفر کی کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

یہ شعر بھی بالکل بے معنی ہے، کیونکہ ایمان کی حقیقت یہ بتانا کہ وہ فی الاصل کفر ہے پابند رسوم، حد درجہ لغو توجیہ ہے۔

اصغر صاحب مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ (کچھ) اکثر استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ بلا ضرورت چنانچہ یہاں بھی موجود ہے اور بالکل بے محل۔

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

اصغر صاحب راز کی جب کوئی بات ظاہر کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایسی ہی عجیب و غریب ہوتی ہے، پہلے انھوں نے راز زندگی، "خودی کا کفن" بتایا اس کے بعد تلاش سراب ظاہر کیا اور اب مجبوری میں پنہاں بتاتے ہیں، جس کا دوسرا نام ان کے یہاں روزنِ زنداں بھی ہے۔

دوسرے مصرعہ کی بے تعلقی پہلے سے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ مبادا اس میں بھی کوئی راز پنہاں ہو۔

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

معلوم نہیں وہ کون سا مقام ہے جس کو ساقی نے آسان بنا دیا۔ اگر یہ کوئی مقام تصوف نہیں ہے تو اس کے مخصوص کرنے میں کیا حرج تھا جبکہ لفظ (اس) کے اشارہ نے یوں بھی ایک حد تک اس کے ابہام کو دور کر ہی دیا ہے۔

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسنِ یار میں ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) کا صرف بالکل بیکار ہے۔ جلوۂ حسن میں ذوقِ دید محو نہیں ہوتا تو کیا لامسہ اور سامعہ محو ہوتے ہیں - اسی طرح دوسرے مصرعہ میں لفظ (اب) یکسر بے محل استعمال ہوا ہے، کیونکہ نظر نام ہی شعاعِ نور کا ہے، اس میں اب اور جب کیا ؟

چاہئے داغِ معصیت اسکے حریمِ ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

محبوب کے دامن عفت کو داغِ معصیت سے آلودہ دیکھنے کی تمنا کرنا اگر کوئی مقامِ تصوف ہے تو اس میں شک نہیں کہ نہایت دلچسپ ہے اگر اس کا تعلق اپنے سے ہو اور حد درجہ رشک انگیز اگر یہ خدمت کسی اور کے سپرد کیجائے

اب وہ عدم، عدم نہیں پرتوِ حسنِ یار سے باغ و بہار بن گیا آئینہ دستِ ناز میں

پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا بالکل بیکار ہے کیونکہ معنی صرف اتنا کہنے سے بھی پورے ہو جاتے ہیں کہ "پرتوِ حسن یار سے دستِ ناز میں آئینہ باغ و بہار بن گیا"۔ اب وہ عدم، عدم نہیں کا شعر سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اول تو آئینہ کو عدم سے تعبیر کرنا درست نہیں اور اگر سادگی کے لحاظ سے اس کو عدم کہا جائے تو دو بار (عدم، عدم) کہنے کی ضرورت نہیں - پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:-

اب وہ عدم نہیں رہا پرتوِ حسنِ یار سے

علاوہ اس کے باغ و بہار کے مقابلہ میں بجائے عدم کے خزاں کہنا زیادہ موزوں تھا یا عدم کے مقابلہ میں بجائے باغ و بہار کے نقشِ وجود، نقشِ حیات کہتے،

مئے بے رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا کبھی میکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

یہ شعر "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کی قسم کا ہے اور فلسفۂ وحدت الوجود سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہی ایک "مئے بیرنگ" ہے جو کبھی میکش نظر آتی ہے اور کبھی ساقی و مینا۔ یہ مئے بیرنگ کیا چیز ہے یہ شاعر کا کوئی ذہنی مفروضہ ہے یا پھر علم نیرنجات کا کوئی تماشہ کہ ایک ہی چیز مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے۔

پہلے مصرعہ میں لفظ (کا) غلط ہے، اس کے بجائے (کو) ہونا چاہئے۔ یہ غزل تقریباً پوری کی پوری "صنعتِ اہمال" میں لکھی گئی ہے اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

از ازل[1] تا بہ ابد محوِ تماشہ ہونا میں وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا

[1] یہ شعر تو اصغر صاحب نے غالباً پیدا ہونے کے بعد ہی کہا ہوگا اس لئے اب "نہ پیدا ہونا" کیسا۔ اصل میں کہنا چاہئے تھا: "نہ زندہ رہنا"، حالانکہ اس صورت میں بھی یہ مما لایحل رہ جاتا کہ وجود کی یہ صورت کہ انسان نہ زندہ رہے نہ مرے کیونکر متعین ہو سکتی ہے اور اس کا تعلق "تماشہ" سے کیا ہے۔ محاورہ کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کی ردیف بالکل غلط قرار پاتی ہے "محوِ تماشہ رہنا" کے بجائے "محوِ تماشہ" ہونا لکھا گیا ہے

سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا[1] ہائے اس شوخ کا ہمشکلِ تمنا ہونا
فصلِ گل کیا ہے، یہ معراج ہے آب و گل کی[2] میری رگ رگ کو مبارک رگِ سودا ہونا
حسن کے ساتھ[3] ہے بیگانہ نگاہی کا مزہ قہر ہے قہر مگر عرضِ تمنا ہونا

یہ تمام اشعار مفہوم کے لحاظ سے نہایت ادنیٰ درجہ کے ہیں اور فن کے لحاظ سے بھی اسقام سے پاک نہیں۔

ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

معنیٔ آدم کجا و صورتِ آدم کجا یہ نہاں خانے میں تھا اب تک نہاں خانے میں ہے
خرمنِ بلبل تو پھونکا عشق آتش رنگ نے رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے
میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی تو کمالِ زندگی کہتا ہے مر جانے میں ہے

یہ تینوں اشعار بالکل مفہوم سے معرّا ہیں اور اصغر صاحب کے مرتبۂ شاعری کی توہین ہے اگر کوشش کر کے کوئی مفہوم ان کا پیدا کیا جائے۔

(باقی)

خطباتِ خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دئے تھے پہلے چار لکچروں میں ترکی کی تاریخ نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پانچویں اور چھٹے لکچر میں ترکی ادب، ان کی شاعری، ان کے ڈرامے اور ان کے صحیح ذوق پر ایک بے انتہا دلچسپ تبصرہ ہے، ساتویں لکچر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کی عورتوں نے کس طرح مردوں کے دوش بدوش قومی تعمیر میں حصہ لیا اور آٹھویں لکچر میں آیندہ کی امیدوں کو پیش کیا گیا ہے۔

انگریزی قیمت ۴ر۔ اُردو قیمت ۳ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

---

[1] "شوخ کا ہمشکلِ تمنا" عجیب بات ہے۔ اور اگر اس "ان ہونی" کو "ہونی" فرض کر لیں تو معنًا یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ جب معشوق خود "ہمشکلِ تمنا" ہو گیا یعنی خود وہ "آرزومند" ہو گیا تو پھر عالم میں بیتابی و شورش کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

[2] پہلے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل بیکار ہے اور صرف وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "رگِ سودا" کا استعمال درست نہیں۔ [3] (ساتھ) بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ "بیگانہ نگاہی" کسی چیز (سے) ہوتی ہے، نہ کہ اس کے (ساتھ)

علم نجوم اور انسانی مستقبل

قدیم زمانہ میں ماہرین علم الکیمیا کی انتہائی تمنا یہ تھی کہ وہ ادنیٰ قسم کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکیں اور ہر چند وہ اس میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن جدید علم الکیمیا کی بنیاد ضرور ڈال گئے جو بغیر قصد و ارادہ کے اس منزل تک پہونچ گیا جو اسلاف کا منتہائے نظر تھا۔ چنانچہ جدید تجربات سے یہ امر بایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ جس چیز کو اسوقت ریڈیم کہا جاتا ہے اور جو دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی عنصر سمجھا جاتا ہے اپنی ابتدائی حالت میں صرف سیسہ تھا اور امتداد زمانہ و طبیعی تغیرات کے زیر اثر آخر کار ریڈیم بن گیا۔

اس اکتشاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعیات اور علم الکیمیا کے باہمی تعلق کی طرف علماء کو غور کرنے کا موقعہ ملا اور آخر کار ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا ممکن ہے یعنی پارہ یا سیسہ کو سونا بنانے کا خیال جو کسی وقت مضحکہ انگیز امر سمجھا جاتا تھا، اب ممکنات میں شمار ہونے لگا ہے۔

اسی طرح علم نجوم کو لیجئے کہ علماء قدیم سیاروں کی گردش کا مطالعہ کر کے انسان کے مستقبل پر حکم لگانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوئے اور اب فلکیات جدیدہ ان کی اس تمنا کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کی صحت اور اس کی قوت عمل بہت کچھ منحصر ہے ملک کی آب و ہوا اور فضا کی حالت پر۔ اگر کسی ملک کی آب و ہوا صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں کی آبادی قوی ہوگی، طویل العمر ہوگی، نشاطِ عمل بھی اس میں زیادہ پایا جائے گا اور اس کا مستقبل بھی شاندار ہوگا۔ اسی طرح اگر موسمی تغیرات کسی ملک کے انسان کے ذہنی رجحانات و قوائے عمل کو مضمحل کر دینے والے ہوں گے تو اس کا مستقبل اسی نسبت سے تاریک ہوگا۔ پھر چونکہ اقلیموں کی آب و ہوا، موسمی تغیرات، طبیعی حوادث کا تعلق آفتاب کی حرارت اور اس کے اضطرابات کہربائی سے ہے اور آفتاب کی یہ اثر اندازیاں بہت کچھ منحصر ہیں ان سیاروں کی گردش پر جو اس کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کی آبادیوں کا مستقبل بڑی حد تک گردش سیارگان پر منحصر ہے۔

اگر سیاروں کی تخلیق و آفرینش کا سلسلہ بند ہوگیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ موسمی تغیرات بھی ایک حال پر قایم رہتے اور اسی لحاظ سے ملکوں کا مستقبل بھی ہمیشہ کے لئے متعین ہوجاتا، لیکن چونکہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور بیشمار اجرام فلکی روزانہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں اس لئے آفتاب کی حرارت اور اس کے تغیرات کہربائی میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور اسی نسبت سے کرۂ ارض کی موسمی کیفیت اور اسکے طبیعی حالات بھی مختلف مقامات میں بدلتے رہتے ہیں۔

اب آیئے ان موسمی اثرات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے کہ انسانی آبادی اس سے کس درجہ متاثر ہوتی ہے سب سے پہلے آپ ہوا کو لیجئے۔

صبح کا وقت ہے، خنک ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے کہ دفعتہً اس میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ درخت اکھڑنے لگتے ہیں، مکان گرنا شروع ہوتے ہیں، ساحل غرق ہوجاتے ہیں، جہاز ڈوبنے لگتے ہیں، ریل کی پٹریاں اکھڑ جاتی ہیں اور ان تباہیوں سے کروڑوں روپیہ کا نقصان انسان کو پہونچ جاتا ہے۔ اسی طرح سردی اور پالے کو دیکھئے کہ ہر سال کتنا خسارہ اسکی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے اور کتنے آدمی اور مویشی برفباری کی شدت سے مرجاتے ہیں۔

خشک سالی سے نقصانات سبھی کو معلوم ہیں۔ آسٹریلیا میں ۱۹۰۳ء کی خشک سالی میں ۶ کروڑ بھیڑیں ضایع ہوگئیں اور ہندوستان و چین میں جہاں اکثر قحط پڑتا رہتا ہے مویشی اور انسان لاکھوں کی تعداد میں مرجاتے ہیں۔

اب موسمی تغیر کے اثرات کو ملاحظہ کیجئے۔ نیویارک میں تعداد اموات اور اسباب موت کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ صرف ایک درجۂ حرارت گھٹنے بڑھنے سے اموات کی کمی و زیادتی پر نمایاں اثر پڑتا ہے اور اگر کبھی دس درجے کا فرق ہوجائے تو موتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، چنانچہ وہاں اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر درجۂ حرارت کا گھٹنا بڑھنا انکے اختیار میں ہو تو صرف امریکہ کے اندر ایک لاکھ پچاس ہزار نفوس کی سالانہ ہلاکت بند ہوجائے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان کا اوسط عمر پانچ سال بڑھ جائے۔

جس وقت مختلف سالوں اور مختلف موسموں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت خشک سردی کے بعد تر گرمی شروع ہوتی ہے تو اموات کا اوسط وہاں ۵۰ ہزار سے دو لاکھ تک پہونچ جاتا ہے۔

اب وبائی امراض کو لیجئے۔ طاعون، ہیضہ اور انفلوئنزا کی تباہکاریاں کس سے مخفی ہیں۔ الغرض موسم اور آب و ہوا کے غیر معتدل ہونے سے جتنے نقصانات نوع انسانی کو ہر سال پہونچتے رہتے ہیں وہ اتنے ہیں کہ اگر اربوں روپیہ صرف کیا جائے تو بھی ان کی تلافی ممکن نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو فلکیات سے کیا تعلق؟ لیکن ایسا کہنا درست نہیں کیونکہ یہ امر بایں تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ موسموں کے تغیر اور طبیعی اثرات کا تعلق بالکل آفتاب اور اس کے داغوں سے ہے۔ جس سال آفتاب میں زیادہ داغ پیدا ہوتے ہیں اسی سال گرمی کم ہوتی ہے اور جب

داغ کم ہوتے ہیں تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔ ہر چند حرارت کی یہ کمی و زیادتی ایک درجہ سے بھی کم ہوتی ہے لیکن اس کے اثرات بہت قوی ہوتے ہیں مثلاً یوں سمجھئے کہ اگر کسی سال آفتاب کے داغ بڑھ جاتے ہیں تو آندھیاں بکثرت چلتی ہیں اور ان سے جتنا نقصان پہونچتا ہے ظاہر ہے، اسی طرح جس سال داغ کم ہوتے ہیں تو خشک سالی ہو جاتی ہے اور اس کی تباہیاں بھی سب کو معلوم ہیں۔

الغرض کرۂ زمین اور اس کی فضا کے تغیرات کا بڑا سبب داغہائے آفتاب کا گھٹنا بڑھنا ہے اور چونکہ آفتاب میں یہ تغیرات دوسرے سیاروں کی وجہ سے ہوتے ہیں اس لئے سیاروں کی گردش سے انسان کا متاثر ہونا لازم ہے۔ اس کو اب ہم کسی قدر علمی تفصیل کے ساتھ سمجھانا چاہتے ہیں۔

پولینڈ کا نہایت مشہور ہیئت داں ارکٹوسکی کہتا ہے کہ اس امر کے دلایل بہ کثرت موجود ہیں کہ آفتاب میں داغ اسوقت نمودار ہوتے ہیں جب گردش کے دوران میں متعدد سیارے ایک ہی سمت میں آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر بور (امریکی) نے اس مسئلہ پر طویل بحث کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ آفتاب کے گرد جتنے سیارے گردش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت دوری پر واقع ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر آفتاب کے کسی ایک سمت میں آجاتے ہیں اور ان سب کا اجتماعی اثر آفتاب کی حرارت پر، اس کی روشنی پر، اسکی جاذبیت اور کہربائیت پر بہت شدید ہوتا ہے۔

آفتاب ہر وقت اپنے چاروں طرف فضا میں کہربائی شعاعیں پھینکتا رہتا ہے اور علماء کہربا کی تحقیق یہ ہے کہ اوپر کا طبقۂ لطیف قبول کہربائیت میں حد درجہ حساس واقع ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب کہربائی دباؤ ایک معین درجہ تک پہونچ جاتا ہے تو پھر فضا میں کہربائی شعاعیں پھیلنے لگتی ہیں اس لئے جب سیاروں کے خارجی طبقات سورج کی کہربائی شعاعوں سے حد درجہ متاثر ہو جاتے ہیں تو ایک معین درجہ تک پہونچنے کے بعد ان سے بھی کہربائی شعاعیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور آفتاب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ تو حال ہوا اُن سیاروں یا اجرام فلکی کا جو آفتاب کے گرد طواف کرتے ہیں اور اسی کے ماتحت سمجھے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ دوسرے نظامہائے شمسی کو لیجئے جو ہمارے آفتاب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور جن کا دائرۂ گردش ہمارے نظام شمسی سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا اثر بھی ہمارے آفتاب پر ہوتا ہوگا اور اس لئے کسے خبر ہے کہ وہ غریب کس اضطراب و ہیجان میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے اور ہر آن کیا کیا تغیرات اس کے حالات میں ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت تک صرف ۳۸ سیارے ایسے دریافت ہو سکے ہیں جو ہمارے آفتاب کو برابر متاثر کرتے رہتے ہیں ان میں پانچ سیارے اب سے تقریباً ۴ ہزار سال قبل ہمارے آفتاب سے بہت قریب آگئے تھے

اور یہ وہ زمانہ تھا جسے کرۂ ارض کا عصر جلیدی (Ice age) کہتے ہیں اور آیندہ اتنی ہی مدت کے بعد سات سیاروں کا اس کے نزدیک آجانے کا امکان ہے گویا کرۂ ارض پر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ عصر جلیدی دوبارہ آنے والا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہی اس کے فنا ہونے کا وقت ہو۔

بہرحال آفتاب کی مختلف حالتوں سے کرۂ زمین کا متاثر ہونا اور دوسرے سیاروں کے قرب و بُعد سے آفتاب کے نوامیس کا متاثر ہونا فلکیات کے حقائق ثابتہ میں داخل ہے اور اس لئے یہ کہنا کہ نجوم کی گردش کا انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا درست نہیں ہے۔

البتہ انفرادی طور پر ہر انسان کے مستقبل پر سیارگان کی گردش سے حکم لگانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس طرح کی پیشین گوئی پر اعتبار کرنا سخت حماقت ہے۔

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۱۰۰۰ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۴۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہوسکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:-

مسئلۂ جبر و اختیار - خواب کی حقیقت - معاد و خلود - طبقۂ نسواں اور غزلگوئی - برج بابل - فاسسٹ جماعت سامری کون تھا - باغ ارم کی حقیقت - فلسفۂ محبت - بھوت پریت - اصحاب کہف - سالویشن آرمی - ہالہ کا سبب - معجزہ و کرامات - فرقۂ معتزلہ - مذہب و عقل - طوفان نوح - یاجوج و ماجوج برہمو سماج - طبقۂ نسواں اور تعلیم - مریخ کی حقیقت - منصور حلاج - چند الفاظ کی تحقیق - اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ، غیر خریداران سے ۱۲ روپے

مینجر نگار - لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشا کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی، ظرافت و محاکات شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۱ روپے - کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔

مینجر نگار - لکھنؤ

چوری

۱

پنڈت راما شنکر چوبے موضع دھرم پور میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اونچی ذات کے برہمن تھے اور مندر کے پوجاری ہونے کے سبب مذہباً ان کا احترام ہر ہندو پر فرض تھا۔ بیچارے دیہاتی اس فرض کی ادائی میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے لیکن اگر کوئی سہواً مہاراج کے پاؤں پڑنا بھول جاتا تو مہاراج اس کو سخت تنبیہ فرماتے۔ مہاراج گاؤں میں زمیندار کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ مندر میں جتنی جائدادیں وقف تھیں ان پر وہ بلا شرکت غیرے متصرف تھے۔ جس وقت مہاراج گاڑھے کی مرزئی اور گاڑھے کی دھوتی پہنکر گاؤں میں سے گزرتے ہوئے ندی پر اشنان کے لئے جاتے تو بستی میں ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پنڈت جی گاؤں میں سے گزریں اور راستہ میں کوئی اپنے دروازہ پر پلنگ بچھا کر بیٹھا رہے۔ بچہ بچہ آکر مہاراج کے 'گوڑ' لگتا اور مہاراج سب کو آشیرباد دیتے ہوئے کھڑاؤں کھٹکھٹاتے ندی پر چلے جاتے۔ ندی میں جاکر اشنان کرتے وقت گھنٹوں سورج نارائن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے اور ان کے نام پر جل چڑھاتے۔ وہاں سے واپس آکر مندر میں دیوی جی کی پوجا شروع کر دیتے۔ گھنٹوں کی ٹن ٹن اور سنکھ کی آواز سنکر بستی کے لڑکوں کی ایک جماعت وہاں آجاتی اور مہاراج سب کو پرشادی دیتے۔

مہاراج سود کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ رام چرن حلوائی۔ سورج مل بزاز۔ رام ٹہلا پاسی سبھی ان کے مقروض تھے۔ دیہات کا جاہل طبقہ روپیوں کے لین دین میں کسی باضابطہ کارروائی کا عادی نہ تھا۔ مہاراج کے پاس ایک بہی تھی جس میں وہ شرح سود کی جتنی مقدار چاہتے لکھدیتے۔ لیکن واجب الادا رقم زبانی طے پاتی اور مہاراج اکثر اسی پر اکتفا بھی کرتے۔ بہی سے مصرف اسوقت لیا جاتا جب کسی شکار کو وہ تاکتے یا جب کسی بدنصیب سے وہ ناخوش ہو جاتے۔ کسی دیہاتی کی مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف چون وچرا کر سکے۔ اس کی قسمت کا فیصلہ خود مہاراج کے رحم وکرم پر منحصر ہوتا۔ جس سے اور جب کبھی وہ چاہتے اپنا انتقام لیتے اور اس طرح لیتے کہ اس غریب کے پاس ایک ٹھیکرا تک باقی نہ رہتا۔

(۲)

دھرم پور گنگا کے کنارے بہت قدیم آبادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب سرزمین ہند

ترقی کے معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں رام نے جنم لیا اور دنیا کو اخلاق و وفاداری کا سبق دے گئے۔ یہیں پیدا ہوئے اور دنیا کو محبت کا ایسا جام پلا گئے جس کی سرشاری قیامت تک فنا نہیں ہو سکتی یہیں گوتم بدھ نے دنیا کی بے ثباتی پر مہر دوام ثبت کی اسی زمانہ کی یادگار دھرم پور بھی ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کے مندر میں اس کمان کا ایک ٹکڑا آج بھی محفوظ ہے جسے توڑ کر رام جی سیتا جی کو بیاہ لائے تھے۔

دھرم پور کی رونق بیشتر منحصر تھی انھیں قدیم روایات پر۔ سال کے مختلف حصوں میں جاتریوں کا گروہ یہاں پہونچتا اور دوکانداروں کو ان کی ذات سے آمدنی کا ایک ذریعہ ہاتھ آجاتا۔ یہاں کا بازار مختصر تھا۔ اسمیں چند دوکانیں حلوائیوں کی تھیں۔ ایک دو دوکان کپڑے کی، کچھ بنئے تھے اور ایک تمباکو کی دوکان۔

پھاگن کا مہینہ ہندوستان میں دیہاتیوں کے لئے اس درجہ روح افزا مہینہ ہے کہ اس کی دوسری مثال دنیا میں نظر نہیں آتی۔ ان کی معصوم مسرتیں حقیقتاً ایک ایسا جذبۂ سرور و بہجت اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں جو شہریوں کو بڑے سے بڑے جشن میں بھی میسر نہیں۔ سال کا یہ مہینہ وہ ایسی خود فراموشیوں میں بسر کر دیتے ہیں جس کی شادمانیوں کو 'سرمایۂ حیات' ہی کہہ کر ظاہر کر سکتے ہیں۔ ہر شخص عبیر اور گلال میں سر سے پاؤں تک لپٹا نظر آتا ہے۔ گاؤں کی معصوم عورتیں ایک دوسرے سے چہلیں کرتی گزر جاتی ہیں۔ بوٹی بوٹی سے زندگی اور جوانی ٹپکتی ہے۔ راستہ میں اگر کوئی مرد ملجاتا ہے تو اس کی دعوت بھی رنگ سے کی جاتی ہے۔ پنگھٹ پر غیر معمولی ہنگامہ ہوتا ہے ایک دوسرے کی پکڑ دھکڑ۔ رنگ و عبیر میں ایک دوسرے کو لت پت کر دینا کچھ ایسے مناظر ہیں کہ چار طرف آگ لگا دیتے ہیں۔

ہولی ختم ہو چکی تھی لیکن ابھی چہروں سے اس کے نشانات محو نہیں ہوئے تھے۔ دوسری صبح کارو حلوائی اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا ناریل پی رہا تھا اور بیچو کہار، رامو کلوار، اور امرت گوالا ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے۔

بیچو۔ (آستین سے انگلیاں مار کر چونہ اُڑاتے ہوئے) بھائی کارو ہولی ختم ہو گئی۔ ہم لوگوں کی دلچسپی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ایشور جانے پھر یہ دن دیکھنا نصیب ہو کہ نہیں۔

کارو۔ (ناریل پر ایک دم لگا کر) ہاں بھائی! بات تو سچ ہے، رام ہی جانے..... لیکن یار اب کے سمے بڑا جشن رہا۔

رامو۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) میں اب بوڑھا ہوا۔ پھر یہ تہوار کہاں اور میں کہاں۔ لیکن یار بیچو! سچ تو یہ ہے کہ اب کے کارو کی بدولت سب کچھ ہوا۔ سچ کہنا کارو یہ سب نئے نئے گانے تم نے کہاں سے سیکھے؟

کارو۔ (اپنی سیاہ گڑکی جلیبیوں سے مکھیاں اُڑاتے ہوئے) بیچو، یہ کیا کہتے ہو! تم سے زیادہ بوڑھے لوگ ابھی بیٹھے ہوئے ہیں..... گیت سیکھنے کہاں جاؤں گا خود ہی جوڑ جاڑ لیتا ہوں۔ سال بھر جب محنت کرتا

ہوں تب کہیں جاکر دو چار گیت بنا پاتا ہوں۔ کیا بتاؤں مجھے ایشور کے بھجن میں کیسا مزہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو رامو! پرہلاد جی اسی ایشور بھگتی کے بدولت انسان سے دیوتا بن گئے۔ انہی کی یاد میں ہم لوگ یہ ہولی کا تہوار مناتے ہیں۔

یہ لوگ باتوں میں مشغول تھے کہ مہاراج راما شنکر جی سے اشنان کرکے اسی طرف آئے اور کارو حلوائی کی دوکان پر آکر کھڑے ہو گئے۔ مہاراج کی صورت دیکھ کر کارو جلدی سے ناریل علٰحدہ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر مہاراج کو "پاؤں لاگن" کیا۔ مہاراج نے آشیرباد دی۔

کارو۔ (اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے) کہو کرپا کی مہاراج! کہئے کیا حکم ہے؟

مہاراج۔ کارو تم تو جانتے ہو میں بے ضرورت تو کہیں جاتا نہیں۔ میں تم سے پوچھنے آیا ہوں یہ مکان کس کا ہے؟

کارو۔ بجرنگ ساہو کار کا سرکار! جس کو مرے ہوئے دو برس ہو چکے۔

مہاراج۔ ہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ کب مرا۔ لیکن تم جانتے ہو یا نہیں یہ مکان وہ مندر میں وقف کر گیا ہے۔

کارو۔ ہاں مہاراج! مجھے کیا سارے گاؤں کو معلوم ہے۔

مہاراج۔ تو پھر تمہیں دو برس کا کرایہ ادا کرنا چاہئے۔

کارو۔ لیکن سرکار! آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ یہ مکان وقف کرنے سے پہلے میں ٹھیکہ پر لے چکا تھا۔ میں نے اس کے بدلے پانچ سو روپئے نقد دئے ہیں۔ یہی شرط تھی کہ جب تک سب روپئے ادا نہ ہو جائیں مجھے کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔

مہاراج۔ میں شرط وط کچھ نہیں جانتا۔ مندر کی تمام چیزوں کی حفاظت مجھے کرنی ہے۔ میں تم سے کرایہ چاہتا ہوں۔

کارو۔ اور میرے روپئے کا کیا ہوگا سرکار!

مہاراج۔ میں کیا جانوں۔ وقف کے کاغذ میں تو کہیں اس کا تذکرہ ہے نہیں۔

کارو۔ سرکار! میرے پاس تو رجسٹری کا کاغذ موجود ہے۔ مہاراج! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ میری عمر بھر کی کمائی وہی پانچسو روپئے تھے۔ میرے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ میں کرایہ کہاں سے ادا کر سکتا ہوں۔

پنڈت راما شنکر کی مغرور طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی کہ ایک غریب حلوائی ان کے ظلم کا تذکرہ زبان پر لائے۔ شعلے کی طرح بھڑک اٹھے۔ غصہ سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ کڑک کر بولے "کارو اب تیری یہ مجال ہو گئی کہ ایک برہمن کو انیائی کہے۔ تیری گستاخی کا مزہ تجھے معلوم ہوگا

کارو۔ ایشور مجھے ناس کریں اگر دل میں گستاخی کا خیال بھی گزرا ہو (پاؤں پر گر کر) مہاراج! صرف روپیوں کا عذر ہے۔ اگر آج سرکار کی طرف سے مل جائے تو کرایہ دینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

"اچھا دیکھا جائے گا" کہکر مہاراج رخصت ہوئے۔

کارو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مہاراج کے غصہ کا انجام کیا ہوگا۔ تمام عمر میں کس طرح خون کو پانی کر کر کے فاقے کر کر کے، مصیبتیں سہہ سہہ کے اس نے اتنی رقم جمع کی تھی تب کہیں جا کر اسے کرایہ سے نجات ملی تھی اور اب اس قابل ہوا تھا کہ روکھا سوکھا دونوں وقت کھا سکے۔ یکایک اپنی پوری دولت کو، زندگی بھر کی کمائی کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر اسے خفقان ہونے لگا۔ اور اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو شاید روپیٹ کر صبر کر لیتا مگر سب سے زیادہ جو چیز اسے خوفزدہ کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اب اس کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی۔ اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ ایک غریب کو، ایک مزدور کو، ایک فاقہ کش، ایک مصیبت زدہ انسان کو اس دنیا میں اتنا حق بھی نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے جائز حق کے چھینے جانے پر زبان بھی ہلا سکے۔ شوخی نہیں، گستاخی نہیں مقابلہ نہیں، محض التجا وہ بھی رحم و کرم کی، لطف و عنایت کی، ایک صدائے احتجاج وہ بھی ظلم و تعدی کے خلاف، لوٹ مار کے خلاف، اپنے حق کے غصب کئے جانے کے خلاف۔ فطرت کا قانون امیر غریب سب کے لئے ایک ہے۔ سب کو ایک طرح ننگا اور تہی دست پیدا کرتی اور ایک ہی طرح خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر انسان کی یہ خون آشامیاں کس غرور پر؟ کیا صرف اس لئے کہ ایک کا باپ مرنے کے بعد زر و سیم کا کچھ انبار چھوڑ گیا اور دوسرے کو چاندی کے چمچے سے دودھ پینا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن دنیا ان کی طرف کیوں توجہ کرے اسے غریبوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اگر انسان ہونے کی حیثیت سے، اقتضاء قدرت کے لحاظ سے، غریبوں کے بنیادی احساسات کا بھی خیال کیا جائے تو سرمایہ داروں کی غلامی کون کرے۔ ان کے حرص و آز کے آدم خور عفریت کیسے اپنی غذا بنائیں۔ ان کے یہ فلک بوس محلوں کی تعمیر کیونکر ممکن ہو جب تک غریبوں کی ہڈیوں کے چونے ان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے میسر نہ آسکیں۔ غریب کی بے دست و پائی۔ مجبوری و بیچارگی کچھ ایسی چیزیں نہ تھیں جن کی بناء پر اسے انسانیت کے تمام حقوق سے محروم کر دیا جاتا لیکن شیطنت خود غرضی اور نفس پرستی ایک طبقہ میں فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ایسی صورت میں تو شاید قدرت کے زبردست ہاتھ بھی غربا کی دستگیری میں بیکار ثابت ہوں۔

کارو اپنی اس نئی مصیبت پر غور کرتا ہوا گھنٹوں دوکان پر خاموش و ساکت بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس کے ساتھ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل جاتے کہ ایشور یہ میرے کس پاپ کی سزا ہے۔ کیا زندگی بھر کے لئے کشٹ بھوگنا ہی قسمت میں لکھا ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ کیا پاپ ہے تو اس کی پرائشچت کرتا۔ پھر جب اس کا جی کسی طرح نہ لگا تو دوکان بند کر کے گھر چلا گیا۔ بیوی جسے وہ پیار سے پریمی کہا کرتا تھا اس کی بے وقت آمد سے متعجب ہوئی اور چہرہ پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر اس کا بھی رنگ فق ہو گیا۔ اس کی لڑکی کیسری محلہ سے آگ لیکر واپس آئی، باپ کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو کر پوچھنے لگی:۔

"کیوں پتا جی آج اتنے سویرے کیوں آگئے۔ بہت سست بھی معلوم ہوتے ہیں کیا بات ہے؟"

لڑکی کے سوال پر کارو کی حالت اور زیادہ المناک ہوگئی ..... زخم کو نشتر سے چھیڑ دیا گیا تھا، آبلہ کی ٹھیس لگ گئی تھی، دل و دماغ جل رہے تھے ..... آنکھوں نے اس آگ پر پانی ڈالنا چاہا کامیابی ہوئی لیکن بہت دیر کے بعد۔ بیوی اور بیٹی کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا۔ وہ بھی کھڑی روتی رہیں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ بالآخر کارو کو جب سکون ہوا تو ..... سب کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

کارو۔ پریمی! اب تو مجھے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔

پریمی۔ آخر جائیں کہاں؟۔ اپنا پرایا کوئی بھی تو نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک برہمن کا سراپ ہمیں کہیں نہ چھوڑے گا۔

کارو سراپ کے نام سے تھرا گیا۔ ہاتھ پاؤں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد سنبھلا اور بولا "نہیں پریمی! میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ ایشور پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ایسے سراپوں سے کیا ہوتا اور پھر مہاراج ہمیں کیوں سراپ دینے لگے، ان کی مرضی کے مطابق تو گھر چھوڑ ہی دوں گا۔

پریمی۔ پھر یہیں کیوں نہ رہیں۔ یہاں جنم بھومی ہے۔ پرائی جگہ میں ہم ایسے غریبوں کو کون پوچھیگا؟

کارو۔ یہاں رہنے کی کیا صورت ہے۔ سوال صرف روپے کا نہیں جو میں نے بجرنگ ساہو کو مکان کے لئے دیا تھا۔ بلکہ یہاں تو مجھ سے میری زندگی چھینی جا رہی ہے، میری شرافت، میری عزت سب کچھ خطرہ میں ہے۔ اگر محض دوکان سے علیحدہ ہو جاؤں تو دو برس کا کرایہ کہاں سے ادا کروں۔ اور نہ دینے کی صورت میں معلوم نہیں کیا کیا سزا بھگتنی پڑے۔

پریمی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود جا کر مہاراج سے کہوں گی، گڑگڑاؤں گی، معافی مانگوں گی۔ آخر انسان ہیں رحم کریں گے۔

— ۳ —

شام ہونے کو ہے آسمان پر رنگ و نور کے امتزاج کی وہ کیفیت نمایاں ہے گویا فطرت اہل دنیا کو مسرت و شادکامی کی دعوت دے رہی ہے۔ آفتاب نے کائنات پر سونے کی بارش کر رکھی ہے۔ شاید اسے بھی معلوم ہے کہ دنیا میں صرف زر و سیم کے انبار ہی سے مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

رات ابھی شروع ہوئی ہے۔ مہاراج راما شنکر ابھی ابھی سندھیا ختم کر کے بیٹھے ہیں کہ لالہ سورج مل آئے اور پرنام کر کے بیٹھ گئے۔ مہاراج نے انھیں اپنے پاس کمبل پر جگہ دی۔

لالہ سورج مل دھرم پور کے سب سے بڑے دوکاندار تھے۔ لیکن اقتصادی اعتبار سے ان کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ہمیشہ مہاراج راما شنکر کے قرضدار ہی رہتے اور یہی سبب تھا کہ وہ مہاراج کے سب سے بڑے

آلۂ کار تھے۔ لالہ جی کی بزازے کی دوکان تھی جو کار و حلوائی کی دوکان کے برابر واقع تھی۔

مہاراج۔ لالہ جی افسوس ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ..... اتنی مدت گزر گئی۔

لالہ جی۔ کیسی باتیں ہیں مہاراج! آپ کا حکم اور میں پورا نہ کروں۔ سارا انتظام ٹھیک ہو گیا ہے۔ اتنی دیر تو قصداً کی گئی، ایسا نہ ہو لوگوں کو بد گمانی پیدا ہو جائے۔

مہاراج۔ آپ بھی بڑے بزدل ہیں۔ ٹھہریے نامار واڑی۔ کوئی بدگمانی کر کے میرا کیا بگاڑ سکتا ہے مجھے ان باتوں کی کب پرواہ ہوئی ہے۔ اچھا خیر، مگر اب دیر نہ ہونا چاہیے۔

لالہ جی۔ ایشور نے چاہا تو کل ہی مہاراج!

گفتگو یہاں تک پہونچی تھی کہ ایک عورت میلی ساری پہنے آئی اور دروازہ کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی

مہاراج۔ بندھو! ارے بندھوا (مہاراج کا نوکر) دیکھ کون آیا ہے؟

بندھو۔ سرکار کار و حلوائی کی جنانہ (بیوی) ہے۔

مہاراج۔ پوچھ اسوقت کہاں آئی ہے؟

ابھی بندھو نے کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ پریمی مہاراج کے چرنوں میں گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔ آنسو جاری تھے، ہچکیوں سے وہ اچھی طرح بولنے پر قادر بھی نہ تھی

پریمی۔ مہاراج..... دیا کیجئے ... آپ بر... ہمن..... ہیں اور... واہ آپ کے... داس۔ ان سے... پاپ ہو اب اُن کو..... کشٹ سے بچا لیجئے۔

مہاراج۔ میں نے کیا کیا ہے؟ میں تم سے سندر کا حق مانتا ہوں اور جب تک یہ نہیں لیگا زبانی معافی مانگنے سے کیا کام چل سکتا ہے۔ دیوی جی کی چیز میں کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ لالہ سورج مل! تم ہی انصاف کرو میں کیا غلط کہتا ہوں!

لالہ جی۔ بہت صحیح ہے مہاراج۔

پریمی۔ لیکن مہاراج..... میں اس سے انکار تو نہیں کرتی۔ ٹھیکہ کے روپئے بھی تو واجب ہیں۔ اور اگر ہم لوگ اس سے محروم کر دئے گئے تو پھر کھانے کا ٹھکانہ بھی ہم لوگوں کے لئے باقی نہ رہے گا

مہاراج۔ آج پھر گڑے مردے اکھاڑنے آئی ہے۔ مرد ہار چکا تو عورت بحث کرنے آتی ہے۔ میں فضول بکواس نہیں سننا چاہتا۔ تم لوگ دیوی جی کا حق ہضم کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اس سے کیا وہ خود تم سے وصول کر لیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ کرودھ (غضب) تم لوگوں کو خاک کر دے۔

پریمی۔ مہاراج سراپئے نہیں۔ میں آپ سے دیا کی التجا کرنے آئی ہوں۔ غریب ہوں زندگی کا بردان مانگتی ہوں

عزت اور آبرو کی بھیک مانگتی ہوں - کرپا کیجئے مہاراج! میں سب کچھ کردوں گی جو آپ کی آگیا ہوگی لیکن اتنی پرارتھنا سن لیجئے - غریب ہوں بھوکوں مرجاؤں گی - مکان چھوڑنے کو طیار ہوں لیکن سراپئے نہیں

مہاراج - مکان چھوڑ دو گی اور کرایہ کون ادا کرے گا - میں اسے معاف نہیں کرسکتا -

پرمی - پیسہ پیسہ کو تو محتاج ہوں کرایہ کی رقم کہاں سے دے سکتی ہوں - اتنی دیا کیجئے مہاراج!

مہاراج - بس میں فضول بکنا نہیں چاہتا - مجھے پاٹ کرنے ہیں، میں کب تک تمہارے ساتھ سر کھپاتا رہوں گا -

آخرکار پرمی مایوس ہوکر مکان لوٹ آئی -

صبح کا وقت ہے، آفتاب نکل آیا ہے - بازار کی دوکانیں کھلنی شروع ہوگئی ہیں لالہ سورج مل اپنی دوکان میں داخل ہوئے اور یکبارگی چیخ پکار شروع کردی - دوکان میں چوری ہوگئی تھی دوکان کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو سو روپئے نقد اور کچھ کپڑے چور اٹھا لے گئے - چور دوکان میں پشت کی دیوار کاٹ کر داخل ہوئے تھے - دوکان کے سائبان کے بعد ایک کوٹھری تھی جو گودام کا کام دیتی تھی - دوکان کی پشت پر کھنڈر زمین تھی چوروں نے اسی طرف سے کوٹھری کی دیوار کاٹ دی تھی - ہنگامہ سنکر گاؤں کے لوگ ٹوٹ پڑے - مشورہ کے بعد پولیس کی چوکی میں خبر دی گئی - تھوڑی دیر میں پولیس سب انسپکٹر دو کانسٹبل کو لیکر موقعہ پر آگئے - تحقیقات شروع ہوگئی - لالہ سورج مل نے بتایا کہ کارو حلوائی کی دوکان پر گاؤں کے چند بے فکرے جمع ہوکر بھجن گایا کرتے ہیں ممکن ہے یہ انہی لوگوں کا فعل ہو - پولیس کیلئے اتنا اشارہ کافی تھا - دھڑا دھڑ تلاشیاں ہونے لگیں - کارو حلوائی کا مکان بھی اس زد میں آگیا - تلاشی لینے پر ایک صندوقچہ ٹوٹا ہوا اس کے کھنڈر میں پایا گیا جسے سورج مل نے پہچانا کہ یہی صندوقچہ ہے جس میں روپئے رکھے گئے تھے - گھر کا ایک ایک کونہ چھان ڈالا گیا لیکن کوئی دوسری شئے برآمد نہ ہوسکی ہاں ایک جوڑ چاندی کے کنگن ملے جسے سورج مل نے کہا کہ کل ہی کامدیپ سنگھ نے اس کے یہاں رہن رکھے تھے اور یہ بھی اسی بکس میں پڑے ہوئے تھے - کارو کا بیان تھا کہ کئی برس ہوئے یہ کنگن اس کی پرمی کو اس کے ماں باپ نے دئے تھے - لیکن اس کا کوئی ثبوت وہ پیش نہیں کرسکتا تھا - کارو کی سسرال میں اب کوئی نہ تھا سب مرچکے تھے - اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں بنے اور کس وزن کے تھے - کپڑے اور روپیوں کا کچھ پتہ نہ چلا - سب انسپکٹر نے دونوں کے بیانات قلمبند کئے - کارو مجرم تھا - پولس نے حراست میں لے لیا -

کارو کی حالت نہایت قابل رحم تھی - دیوانوں کی طرح سب کا منھ تک رہا تھا - آنسو خشک تھے اور اب اس میں یہ بھی صلاحیت نہ تھی کہ اپنی برأت میں ایک لفظ بھی کہہ سکے - پرمی اور کیسری پچھاڑیں کھا رہی تھیں - سب انسپکٹر کے سامنے ہزاروں منتیں کیں - خوشامد کی لیکن قانونی شکنجے سے کسی طرح نجات ممکن نہ ہوسکی گاؤں

کے تمام لوگ کارو کی ایمانداری سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ حیرت میں تھے کہ یکایک کارو پر شیطان کیونکر سوار ہو گیا۔ یقین کرنے کو ان کا جی ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ حرکت کارو کی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہے تھے بکس کارو کے مکان سے نکلا تھا۔ آنکھوں کو کس طرح جھٹلا دیتے۔ جرم ثابت ہو چکا تھا اور کارو سب کی نظر میں ذلیل ہو کر رہ گیا تھا۔

تھانہ پر پہونچکر ضروری کاغذات مرتب ہوئے تھانیدار نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کوئی ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ امرت کوالے نے اس کی ضمانت دی اور رہائی دلا کر مکان واپس لے آیا۔

شام کے وقت رامو کاندو، بیچو کہار اور امرت سب کے سب کارو کے مکان پر جمع ہوئے۔ امرت نے کہا:۔

"کارو، زیادہ فکر نہ کرو۔ اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ تمہاری بے گناہی کا ہم سب کو یقین ہے۔ لیکن یار یہ ہوا کیونکر؟ لالہ سورج مل سے تم سے کہاں کا بیر تھا کہ اس کا بدلہ لیا۔

کارو۔ کیا کہوں اپنی قسمت کے سوا کس کو دوش دے سکتا ہوں۔ یہ پہلے جنم کا پاپ ہے جس کے بدلے اس جنم میں نرکھ میں جل رہا ہوں۔

بیچو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کرودھی نے تمپر یہ جال بچھایا ہے۔

کارو۔ میرا اس گاؤں میں کوئی دشمن نہیں پھر کس کو الزام دوں؟

رامو۔ یار ایسے جو کچھ کہو۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔ بیچو ذرا ادھر اُدھر دیکھ لو کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس روز جو مہاراج رامانشکر سے تم سے باتیں ہوئی تھیں اس پر وہ بے طرح بگڑ گئے تھے۔ میرا اسی روز ڈر گیا تھا کہ کہیں تم سے وہ بدلہ نہ نکالیں۔ وہ ہمیشہ اپنے دشمن کو اسی طرح تباہ کر ڈالتے ہیں۔ دیکھا نہیں ہرناتھ لال کا گھر تک بکوا دیا۔ گوپی چمار کو کس طرح پٹوایا۔ بیچارے ہرناتھ کو تو گھر ہی چھوڑ دینا پڑا اب وہ گورواس پور میں رہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی کارو کا چہرہ زرد ہو گیا اور گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا:۔

کارو۔ ہر ہن اور اتنا کرودھی۔ کل پرمی وہاں گئی تھی۔ اچھا یاد آیا اس نے آکر کہا تھا کہ لالہ سورج مل اور مہاراج آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اب تو مجھے بھی شبہ ہوتا ہے۔ لیکن رامو! میرے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے میری مٹی تو پلید ہو چکی۔ میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔

— ۵ —

کارو نے چوری کی تھی یہ صرف قانونی جرم نہ تھا۔ سماجی جرم بھی تھا۔ پنچ کے سامنے اسے جواب دینا تھا، اور اگر اس کا عذر قبول نہ ہوا تو پھر اپنی ذات والوں کے سامنے بھی اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔

رام چرن حلوائی نے ساری باتیں پنچ کے سردار سے جا لگائیں اور مقررہ تاریخ میں سب کے سب جمع ہو گئے انسان کی فطرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس میں انتہائی لچک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ عاجز و بیکس انسان مصائب برداشت کرتا ہے، تکلیفیں اٹھاتا ہے اور اپنی بیچارگی کو روتا ہے۔ یہی مصائب یہی اذیتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو اس میں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ رونما ہوتا ہے۔ پھر اس کی شدت اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مخالف قوت کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فطرت اور خدا سے بھی برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ کارو عاجز تھا، بیکس تھا، غریب تھا، اور مصائب کا شکار۔ لیکن رامانشنکر اور لالہ سورج مل نے اسے انتہائی ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، اب زیادہ برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ پوری قوت سے مقابلہ کرنے کو طیار ہو گیا تھا۔ دولت تو خیر تھی ہی نہیں، عزت و آبرو جو بچ رہی تھی اسے بھی لوٹا جا رہا تھا۔ پھر وہ کس لئے ان کی پرواہ کرتا۔ پنچ کے سامنے جو اس نے بیان دیا وہ گاؤں والوں کے لئے جس درجہ بھی تعجب خیز ہو۔ لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ حریف سے اب پوری طرح جنگ کے لئے آمادہ تھا۔ اس نے کہا:۔

"مجھے سزا بھگتنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ایشور کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ یہ سب میرے دشمن کی کارروائی ہے۔ میں نے مہاراج سے روپیوں کا عذر کیا تھا۔ انھیں یہ گوارا نہ ہوا۔ اس پر بھی میں مکان چھوڑنے کو طیار تھا۔ لیکن وہ مجھ سے دو برس کا کرایہ بھی طلب کرتے ہیں۔ آپ لوگ انصاف کیجئے ایک محتاج جو کھانے کو ترستا ہو اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہے انھوں نے لالہ جی سے کہہ کر یہ تمام انتظام کرایا اور مجھے دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا۔ ایشور ان کا بھلا کرے" یہ کہتے کہتے کارو رونے لگا۔ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "آپ لوگ جھوٹ سمجھیں گے لیکن ایشور جانتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ کل بھی میرے پاس آئے اور کہہ رہے تھے کہ اب بھی بچنا چاہتے ہو تو کرایہ کی رقم ادا کر دو۔ میں کہاں سے دے سکتا ہوں میں نے جا کر کہہ دیا اب دوسرے جنم میں لیجئے گا مہاراج! اب میں حاضر ہوں آپ لوگ جو سزا چاہے دیجئے" پنچوں نے کارو کا بیان سنا۔ ہر شخص متاثر ہوا۔ رام چرن حلوائی نے کہا "ان فضول باتوں سے کیا حاصل ہے۔ جرم ثابت ہے اس کی سزا کارو کو بھگتنا پڑے گی"

پنچ کے سردار نے کہا۔ "ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کارو نے سچ مچ جرم کیا ہے۔ ممکن ہے حقیقتاً بے قصور ہو۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم لوگ کارو کے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار کریں اس کے بعد ہم لوگ صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں گے"

یہ بات سب لوگوں کو پسند آئی اور پنچ کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا۔

—۶—

مقدمہ کے دوران میں غریب کارو کو کئی بار کچہری دوڑنا پڑا۔ اس کے پاس روپے نہ تھے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل کرتا۔ پرمی کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے زیور تھے انھیں فروخت کر دیا اور بابو کرشنا پرشاد وکیل کی خدمات

میں حاضر ہو کر اپنے دکھ کی ساری داستان سنائی۔ انھیں کچھ ترس آگیا اور بہت تھوڑی فیس لیکر کام کرنے کو راضی ہو گئے۔

دوران مقدمہ میں سورج مل بھی طلب کیا گیا اور جب کئی دوسرے کنگنوں کے ساتھ ملا کر مسروقہ کنگن رکھ دئے گئے اور اس سے شناخت کے لئے کہا گیا تو وہ بالکل ناکام رہا۔ وہ صحیح وزن بھی نہ بتا سکا۔ بابو کرشنا پرشاد نے جرم میں وہ داستان بھی چھیڑ دی کہ کس طرح پنڈت راما شنکر زبردستی کارو کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور دو برس کا کرایہ بھی وصول کرنا چاہتے ہیں۔ لالہ سورج مل سے بھی اقرار کرالیا کہ پنڈت راما شنکر سے برابر روپیوں کا لین دین اور دوستانہ ہے۔ تمام کارروائی کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ صادر کر دیا۔ جس میں کارو حلوائی بری کر دیا گیا تھا مجسٹریٹ نے تمام کارروائی سازشی قرار دی۔ لیکن قانونی ثبوت نہ ہونے کے سبب سے پنڈت راما شنکر پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انھیں تنبیہہ کی گئی تھی کہ اگر وہ کسی قسم کی سختی مکان کے متعلق کارو پر کریں گے تو سخت سزا کے مستوجب قرار دئے جائیں گے۔ ساتھ ہی کارو حلوائی کو لالہ سورج مل کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ چلانے کا حکم دیا گیا۔

فیصلہ کی خبر بجلی کی طرح گاؤں میں پہونچ گئی اور ساری بستی میں پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کو اس مقدمہ سے خاص تعلق تھا۔ ہر گھر میں خوشی پھیل گئی۔ لیکن پنڈت راما شنکر اور لالہ جی کے لئے تو قیامت ہو گئی۔ بچہ بچہ کہہ رہا تھا کہ غریب کو ستایا گیا — ایشور ان کے پاپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

کارو کے گھر میں عید ہو گئی۔ کیسری جلدی جلدی درگا استھان جانے کی طیاری کر رہی تھی۔ آج وہاں گھی کے دئے جلائے گی اور مہابیر جی پر مٹھائی چڑھائے گی۔ اسی چہل پہل میں نصف شب گزر گئی۔ پریمی اور کیسری خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔ آج انھیں نیند بھی نہیں آرہی تھی، دروازہ پر کسی کے پکارنے کی آواز آئی کارو اٹھکر باہر گیا دیکھا تو مہاراج اور لالہ سورج مل کھڑے ہیں۔ مہاراج کہنے لگے "کارو! دیکھو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم لوگوں کو آخر اسی بستی میں رہنا ہے۔ لالہ جی تم سے کشما مانگنے آئے ہیں تمھارے نقصان کے عوض یہ دو سو روپئے دیتے ہیں۔ اسے قبول کر لو اور اب مقدمہ چلانے سے تمھیں کیا فایدہ ہوگا۔ انھیں معاف کر دو۔

مصیبت زدہ دل دوسروں کی تکلیفیں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا قلب دوسروں کی اذیتیں دیکھ کر کڑھتا ہے اور اپنی مصیبت کا نقشہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ کارو کا دل بہت زیادہ دردمند واقع ہوا تھا۔ اسے اپنے آلام یاد آگئے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ کہنے لگا:۔

"مہاراج! آپ کس سے کہہ رہے ہیں۔ اپنے ایک داس سے، برہمنوں کے سیوک سے، میری نظر میں آپ کی وہی عزت ہے۔ مجھے کب گوارا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ایک بھائی کو دکھ پہونچاؤں۔ مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں۔ میں ہرگز آپ کے حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

الیاس اسلام پوری

مکتوبات نیاز

عزیزمن -

کیا پوچھتے ہو کس حال میں ہوں اور کیا بتاؤں کہ عمر کس طرح بسر ہوتی ہے - جو زمانہ گزر گیا اسکی بربادی کی یاد، جو گزر رہا ہے وہ یکسر حسرت آباد — شکوہ کروں بھی تو کس کا اور کس زبان سے!

ہستی بہ تپش رفت و اثر نیست نفس را
فریاد، کزیں قافلہ بردند جرس را

جانتا ہوں کہ چھیڑتے ہو - تاکہ میں کچھ کہوں اور تم منھ پھیر کر ہنسو - چلو، ہٹو، میں اب اس حال میں نہیں ہوں کہ کسی کو ہنستا دیکھوں اور خوش ہوں -

مجھ سے ہمدردی کی باتیں نہ کرو، ورنہ سچ کہتا ہوں تم سے نفرت ہو جائے گی - تمھارے وہ حزیں و ملول آنکھوں والے دوست کل ملے تھے، تم کو پوچھتے تھے - میں نے کہا بہت بُرا حال ہے - اس کا جواب انھوں نے کیا دیا، جب آنا تو خود انھیں سے پوچھنا - میرے کہنے کا اعتبار تمھیں کیوں آنے لگا! تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ جن آنکھوں کو تم نے ہمیشہ سوگوار دیکھا، کل وہ ہنس رہی تھیں - اب یہ خبر نہیں کہ میرے قال پر یا تمھارے حال پر - ابھی تو کہیں باہر جانے کا قصد نہیں ہے - تاہم اپنی آمد کی اطلاع دو دن پہلے دیدینا تاکہ تمھارے جانے کے بعد جو دو دن تک گھر ویران رہیگا اس کی تلافی پہلے ہی ہو جائے -

---

سنو جی، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں - اور جب کوئی کسی سے خفا ہوتا ہے تو بات نہیں کیا کرتا - میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت بیتاب ہوگے، لیکن ہوا کرو میری بلا سے، نہ میرے پاس اتنا وقت کہ وہاں جاکر تمھارا پیام کہوں اور نہ شاید انھیں اتنی فرصت کہ اطمینان سے سنیں اور جواب دیں - تم کو اپنی التجا پر ناز ہو یا نہ ہو لیکن انھیں اپنی بے نیازی پر ضرور ہے - مگر تمھیں یقین کیوں آنے لگا؟ اور ہاں میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں خفا کیوں ہوں اور تم سے باتیں بھی کرنے لگا لاحول ولا قوۃ!

قبلۂ محترم ۔ صحیفۂ گرامی عزیزی یوسف کے ذریعہ سے پہونچا۔ آپ کو باور آئے یا نہ آئے لیکن جو احترام حضرت کا میرے دل میں ہے وہ قطعاً بیان و اظہار سے بے نیاز ہے۔ لفظ احترام میں نے ادباً استعمال کیا ورنہ مجھے محبت کہنا چاہئے تھا۔

آپ نے جس رافت و ہمدردی سے، جس محبت و عنایت سے، میری رسوائی پر آنسو بہائے ہیں، وہ رگ سنگ سے بھی لہو ٹپکا دینے کیلئے کافی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ میں بہرا بھی ہوں اور گونگا بھی۔ یعنی اب سوائے ایک دل کی آواز کے نہ کوئی اور صدا کانوں میں آتی ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور بات زبان سے نکلتی ہے۔

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
ناخدا باد بود کشتیِ طوفانی را

آپ کے سامنے نہ دلیل پیش کرنے کا یارا، نہ حجت طلب کرنے کی جرأت۔ آپ جب تک مجھے خوش نصیب سمجھتے رہے، میں خوش نصیب تھا، اب آپ بدقسمت کہتے ہیں تو میں بدقسمت ہو۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کا حوصلہ کبھی نہ ہوا تو اس کے شکوہ کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں۔

گفتہ بودی ہمہ زر قند و فریبند و فسوس
سعدی آں نیست دلیکن چو تو فرمائی ہست

آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے اور مجھے یقیناً اولین فرصت میں حاضر ہونا چاہئے، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا حضرت کا یہ لطف و کرم بھی ہاتھ سے کھو بیٹھوں۔ کیونکہ جناب کو شاید علم نہیں کہ میں داڑھی منڈا کر اب صورتاً بھی مسخ ہو گیا ہوں۔ خدانخواستہ اگر آپ کی نگاہ کو کوئی گزند پہونچ گیا تو میں کیا کروں گا ـــــ ایام دولت مستدام!

حقیقت یہ ہے کہ تم سا لغو انسان میں نے تو آج تک نہ دیکھا نہ سنا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تخلیق نوعِ انسان کے وقت ذہنِ فطرت میں بھی نہ ہوگا۔ گردن اٹھاؤ، ذرا آنکھ میں آنکھ ڈال کر جواب دو۔ خاکم بدہن، میں نے کب اور کس سے کہا تھا کہ مولانا کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔ ذکر عام مولویوں کا تھا کہ ہمارے مولانا کا، جن کا جواب خرابات میں بھی نہیں ملسکتا چہ جائیکہ محراب و منبر!

انھوں نے جس انداز سے شکوہ کیا ہے، اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا سر پھوڑ ڈالوں یا تمھارا۔ تم پر اختیار نہیں اس لئے اپنا ہی سر پھوڑنا پڑے گا۔

میں نے مولانا کو خط لکھا ہے اور جتنی برائیاں میں تمھاری کر سکتا تھا وہ سب کر دی ہیں۔ گالیاں مجھے زیادہ یاد نہیں تاہم جتنی یاد تھیں وہ بھی دے ڈالی ہیں۔ وہ تمھیں میری تحریر دکھائیں گے تو نہیں، لیکن

ممکن ہے باتوں ہی باتوں میں پھر اس ذکر کو چھیڑیں، اس لئے میں تمھیں پہلے سے مطلع کئے دیتا ہوں کہ اگر اس مرتبہ تمنے پھر غلط بیانی سے کام لیا تو سچ کہتا ہوں آکر ذبح کر دوں گا اور سولی پر چڑھ جاؤں گا۔

مردِ خدا، کسی وقت تو انسان بن جایا کر، سنجیدگی میں مذاق ہو تو کوئی حرج نہیں، لیکن مذاق میں سنجیدگی حد درجہ خطرناک چیز ہے۔

میرے ہمدم و دمساز۔ سلامت رہو کہ میری عافیت کے طلبگار اک تمھیں دنیا میں رہ گئے ہو۔ گو اسی کے ساتھ اس کا بھی یقین ہے کہ

شبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گل را

دنیا میں مصائب دو قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق خارجی اسباب سے ہے اور دوسرے وہ جو خود اپنے احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اُن کا علاج تو تدبیر سے ممکن ہے، لیکن ان کا مداوا کیونکر ہو۔ آگ لگے تو پانی سے بجھائی جا سکتی ہے، لیکن جب میں پانی کو آگ سمجھنے لگوں تو تم یا کوئی اور کیا کر سکتا ہے۔ سو بھائی میری سوختہ سامانیاں بھی بالکل اسی قسم کی ہیں۔ اور مقدرات کا یہی ایک مفہوم میرے ذہن میں آیا ہے۔

میرے لئے دنیا میں کیا نہ تھا، سب کچھ تھا، مگر صرف ایک "پندارِ احساس" نے تمام عالم کو ٹھکرا دیا۔

در ہائے فردوس وا بود امروز
از بیدماغی گفتیم، فردا

پھر اب کہ پُرمایگی و واماندگی کا مفہوم ہی میرے نزدیک بالکل بدل گیا ہے، اگر تمھارے کہنے پر عمل کروں بھی تو بیکار ہے۔ آتشفشانی میں "نقشِ سویدا" درست کرنے کے معنے صرف یہ ہیں کہ "داغِ دل" کے سرمایہ کو اور رسوا کیا جائے۔

محترمہ، آپ کی طویل خاموشی سخت دلخراش تھی، لیکن خلافِ توقع نہ تھی، میں جانتا تھا کہ آپ نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھالی ہے اور میں خود اس کی ابتدا کرتا؟ اس کا امکان صرف اس صورت میں تھا کہ

حسن کو تغافل میں جرأت آزما پاتا

شکر ہے کہ آخر کار آپ کو رحم آ ہی گیا اور مجھے، کہ اب تنکے کا سہارا بھی ہاتھ سے جا رہا تھا، ڈوبنے سے بچا لیا۔ سانحہ کا حال معلوم کر کے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ آپ کی آغوش سب سے پہلی مرتبہ آباد ہو کر یوں دفعتہً اجڑ جائے! قیامت ہے، قیامت!

شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

آپ نے خطاب کا ذکر کرکے ایسا نشتر چبھویا ہے کہ عمر بھر اسے فراموش نہیں کرسکتا۔ اللہ، اللہ، اڈیٹر نیرنگ خیال مجھے ادیب الملک کا خطاب دے اور آپ اس پر اظہار مسرت کریں! تف ہے مجھ پر اور میری ادبیت پر! افسوس ہے کہ اتنا زمانہ میرے آپ کے مراسم کو ہوگیا اور پھر بھی آپ نے نیاز کو نہیں پہچانا۔

از برگ و ساز قافلۂ عود داں مپرس
بے نالہ رودِ جرسِ کاروان مپرس

کیا آپ دل خون کرنے کی کوئی اور تدبیر اختیار نہ کرسکتی تھیں؟

کفارہ کا روزہ رکھنے میں کیا نقصان ہے۔ کیا وہ قسم سے زیادہ مضبوط چیز ہے۔ جس کو دل توڑنے میں باک نہ ہو، وہ روزہ کے باب میں اتنا پس و پیش کرے، حیرت ہے۔ خدا کرے آپ جلد یہ خبر سنائیں کہ اُجڑی ہوئی آغوش پھر آباد ہوگئی ہے۔

اعتبارات

مصلوب

میں نے لوگوں سے التجا کی کہ "مجھے سولی پر چڑھا دو"
انھوں نے کہا کہ "ترا خون ہم اپنے سروں پر کیوں لیں"
میں نے کہا۔ "اگر تم دیوانوں کو سولی پر نہیں چڑھاتے تو پھر یہ زعم فراست کیسا؟
انھوں نے میرا کہنا مان لیا اور مجھے سولی پر چڑھا دیا۔ اب میں آسمان و زمین کے درمیان معلق تھا۔
ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا "یہ کس گناہ کا کفارہ تو نے اس طرح ادا کیا ہے"
دوسرے نے کہا۔ "کس چیز نے تجھے اپنے نفس کی قربانی پر مجبور کردیا"
تیسرے نے پوچھا۔ "اے جاہل کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسی ذلیل قیمت ادا کرکے تو کوئی دوامی شہرت حاصل کرسکیگا"
چوتھا بولا۔ اس کے تبسم کو تو دیکھو۔ کیا کوئی شخص اس تکلیف کے عالم میں اس طرح مسکرا سکتا ہے"
میں نے اُن سے کہا کہ "سوائے اس تبسم کے اور کسی بات کو یاد نہ رکھو۔ کیونکہ نہ میں کسی گناہ کا کفارہ ادا کررہا ہوں اور نہ کوئی قربانی پیش کرکے شہرت دوام حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ بلکہ میں پیاسا تھا اور میں نے تم سے کہا کہ میرا خون مجھے پینے کے لئے دو، کیونکہ ایک دیوانہ کی پیاس صرف اس کے خون ہی سے بجھ سکتی ہے۔

باب الاستفسار

بعض فارسی اشعار کا مطلب

(جناب سید علیم الدین صاحب - ایبٹ آباد)

حسب ذیل اشعار کا مفہوم باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہوسکا- میں ممنون ہوں گا اگر آپ ذریعہ نگار اس طرف توجہ فرمائیں گے- یہاں ایک صاحب کو اسی قسم کے بہت سے اشعار یاد ہیں اور وہ اپنے احباب کے سامنے بڑھکر اکثر ان کی قابلیت کا امتحان لیا کرتے ہیں-

دلازاری مکن، باری بکن باری دلازاری — دلازاری نکو نبود نکو باشد دلازاری

زرنجش حدیث بدرہا کن — زرنجش حدیث بدرہا کن

آں دگر شیرست کادم میخورد — آں دگر شیرست کادم میخورد

خوردہ ہماں بہ کہ بہ تنہا خوری — وائے براں خوردہ کہ تنہا خوری

(نگار) ذومعنیین الفاظ کی شاعری کا فارسی میں کسی وقت بہت شوق پایا جاتا تھا، اور امیر خسرو نے سب سے زیادہ اس طرف توجہ کی، چنانچہ ان اشعار میں تین شعر انھیں کے ہیں-

اگر آپ ادنیٰ تامل سے بھی کام لیتے تو ان کا سمجھنا مشکل نہ تھا- پہلے شعر کو یہ لکھئے:-

(۱) دل آزاری مکن، باری بکن بکن دلا، زاری — دل آزاری نکو نبود نکو باشد دلا، زاری

یعنی اے دل کسی کا دل نہ دکھا بلکہ کبھی کبھی رولیا کر کیونکہ دل آزاری نہیں بلکہ زاری اچھی چیز ہے-

(۲) پہلے مصرعہ میں بدرہا جمع ہے بدرہ کی جس کے معنی کیسۂ پُرازر" کے ہیں اور دوسرے مصرعہ حدیثِ بد علٰحدہ ہے اور رہاکن علٰحدہ۔ مطلب یہ ہوا کہ روپیہ دو اور تھیلیوں کی بات کرو۔ روپیہ دو اور بُری باتیں کرنا چھوڑو۔

(۳) پہلے مصرعہ میں شیر بہ معنی ہزبر ضیغم مستعمل ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ میں دودھ کے معنی میں۔ مدعا شاعر کا یہ کہنا ہے کہ وہ شیر ہے جو آدمی کھا جاتا ہے اور وہ دودھ ہے جس کو آدمی کھاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں آدم مفعول ہے میخورد کا اور دوسرے میں آدم فاعل واقع ہوا ہے

(۴) پہلے مصرعہ میں تنہا جمع ہے تن کی اور دوسرے میں تنہا، (اکیلے) کے معنی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کھانا وہی بہتر ہے کہ لوگوں کے ساتھ بیٹھکر کھایا جائے اور وہ کھانا کچھ نہیں کہ تنہا کھا لیا جائے۔

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کیجاتی ہے

(سنہ ۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۲۳ء) مئی ۲ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری فروری، مارچ اپریل، مئی، اگست ۲ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۲۷ء) اپریل مئی، جون ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری، مئی، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۶ر فی پرچہ (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اکتوبر ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست ستمبر، نومبر، دسمبر ۸ر فی پرچہ۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فائل سے رہیں معہ محصول

منیجر نگار۔ لکھنؤ

ہندوستانی دواخانہ کی مشہور عالم ادویات

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۲

حب جواہر
قیمت ۱۲ گولیوں کی دو روپئے

یہ جواہرات اور دوسرے قیمتی اجزا سے تیار کی جاتی ہے۔ دل و دماغ۔ جگر اور معدہ کے ضعف کو دور کرنے اور حرارت غریزی کو برانگیختہ کرنے کے لئے لاثانی دوا ہے۔ عام جسمانی کمزوری خصوصاً اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے بہترین چیز ہے جو کسی بیماری سے اچھا ہونے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔

عشرتی خاص
قیمت ۲۰ گولی پانچ روپیہ

قوت مردانہ کے لئے عجیب و غریب دوا ہے ایک قدیم شاہی نسخہ کے مطابق جدید سائنٹفک طریقہ سے تیار کی جاتی ہے۔ اسکے استعمال سے مردی کے خزانے یعنی اعضائے رئیسہ کی طبعی اور قدرتی قوتیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی ہیں۔ جوہر کچلہ۔ فاسفورس وغیرہ دواؤں کے مانند اس کا فایدہ وقتی اور عارضی نہیں بلکہ مستقل اور پائدار ہوتا ہے۔

طلائے مقوی
قیمت ۳ ماشہ کی شیشی تین روپئے

یہ طلا خاص طور پر ان لوگوں کے لئے تیار کیا گیا ہے جن کی قوت مردانہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے اس طلا کے استعمال سے تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کی قوت اور تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری عمر کے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے۔

عرق ماءاللحم خاص الخاص
قیمت فی بوتل پانچ روپئے

جسمانی قوتوں کو قوی کرنا اعضائے رئیسہ اور ارواح کو قوت دینا اور حرارت غریزی کو برانگیختہ کرنا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ صالح اور جید خون بکثرت پیدا کرتا ہے اور قوت باہ و امساک کے لئے حیرت انگیز اثر رکھتا ہے۔ ہندوستانی دواخانہ کی خاص چیز ہے۔ دوسری جگہ اصلی ملنا ناممکن ہے۔

گن فن
طاقت کی بے نظیر دوا ہے۔ سوفی صدی کو اس سے فایدہ پہونچا۔ حکیم محمد احمد صاحب کا خاص مجوزہ نسخہ ہے ایک بکس استعمال کرنے کے بعد آپ کو کسی ٹانک کی تلاش نہ ہوگی۔ تمام سردیوں میں استعمال کر لیجئے۔ سال بھر آرام سے گزرے گا۔ قیمت ۶ گولی سات روپئے۔

مصفی الدم
خون کی خرابی سے جس قدر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی تنہا ایک دوا مصفے ہے۔ داد۔ کھجلی۔ سوزاک آتشک۔ برص۔ جذام۔ بواسیر۔ عرق النساء صرف خوراکوں کی کمی بیشی سے مندرجہ بالا بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ قیمت ۲۴ خوراک عصر۔

شربت صدر
نزلہ کا بے نظیر علاج۔ کیسی کھانسی ہو چار خوراک میں بلغم نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ گلے کے غدود پھولے ہوئے ہوں۔ یا خون تھوکتا ہو۔ ایک ہفتہ میں خون رک جاتا ہے۔ دق کے مریض اس پر زندہ ہیں۔ یہ کہنے کا حق ہم کو حاصل ہے کہ بگڑے ہوئے نزلہ کی کوئی دوا مادو کیٹ میں اس کا لگا نہیں کھا سکتی۔ قیمت آٹھ خوراک کی شیشی آٹھ آنے۔

اکسیر نسواں
عورتوں کے لئے آب حیات کا کام کرتی ہے سیلان الرحم۔ ضعف رحم، ورم، ایام کا بے ترتیب آنا۔ کارخانہ ہذا کی مایہ ناز دوا ہے۔ قیمت ۱۲ خوراک کی شیشی بارہ آنے (۱۲/)

فہرستیں ہر زبان کی طلب کرنے پر مفت روانہ کی جاتی ہیں

ملنے کا پتہ:- منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت علاوہ محصول عا

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اسکی زبان اسکی تمثیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت بیماری شہرت و گمنامی غیرہ پر صحیح پیشگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان "شباب کا لکھا ہوا افسانہ" حسن و عشق کی تمام پیچیدگیوں کیفیات اس کا ایک مجملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاد کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ قیمت دس آنے علاوہ محصول۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ مقدمہ کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کی بہترین نمونے نظر آئے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول (۱۲)

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین قلمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گمنام فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ ۲۔ مادین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت غیر علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہو اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت (۱۲ر) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ علاوہ محصول۔

گہوارۂ تمدن

یہ دوسرا ایڈیشن ہے جسمیں تاریخ و اسلامیہ کی ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا تہذیب و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک انعام ملا تھا قیمت عہ علاوہ محصول۔

صحابیات

جسمیں عہد سعادت کی مقدس خواتین کے مستند حالات یکجا درج کئے گئے ہیں اسکا مطالعہ جسے مؤلف نے حاصل کرنے کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اردو میں یہی دیگر مصنفین کی موجود ہیں لیکن اتنی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں قیمت عہ علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مسئلہ کا اردو میں پہلا اور بہترین ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی یہ رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیبان جیسی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا۔ اس کے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

عرض نغمہ

یعنی [illegible] کی گیتان جلی کا اردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر [illegible] نے کہا تھا کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان جلی کا اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ ″	۲۵ ″	۱۳ ″	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ ″	۱۳ ″	۷ ″	۴ روپیہ

۱۔ اُجرت بہرحال پیشگی دی جائیگی۔ دوچار یادہانی خط کے ذریعہ دی جائیگی۔

۲۔ جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا لکھا ہے اُسکی رقم پیشگی لینا ہوگی۔ لی جائیگی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ دہی ماہانہ رہے گا۔

۳۔ اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت سے ہو سکتا ہے۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر..... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر..... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند..... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند..... ۷ شلنگ

نوٹ:۔ رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

جملہ جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔ "مینیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب

یہ جلد اول ہے جسمیں ۲۲ء سے لیکر ۲۵ء تک کے استفسارو جواب شائع کئے گئے ہیں۔ باقی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو حیثیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس مجموعہ میں علمی ادبی تاریخی انتقیدی مسائل ہیں۔

قیمت علاوہ محصول (۳ ے)

مکتوبات نیاز

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگار کی دلسلاست بیان رنگینی اور ادائے مطلب کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خط و کتابت بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے مقالات ادبی دوسرا مجموعہ، جس میں ۳۲ء افسانے ۲۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزہ فن اور ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔

قیمت تین روپیہ (۳ ے) علاوہ محصول۔